پاکستانی ادب کے معمار

خواجہ محمد زکریا: شخصیت اور فن

ڈاکٹر امجد طفیل

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

(سلسلہ ۱۶۱)

خواجہ محمد زکریا: شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

خواجہ محمد زکریا: شخصیت اور فن

ڈاکٹر امجد طفیل

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

نگرانِ اعلیٰ	:	ڈاکٹر یوسف خشک
مدیرِ اعلیٰ	:	محمد عاصم بٹ
مصنف	:	ڈاکٹر امجد طفیل
نظرِ ثانی	:	ڈاکٹر محمد کامران
طباعت	:	اختر رضا سلیمی
اشاعت	:	2021
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	نست پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: -/300 روپے
		غیر مجلد: -/260 روپے

ISBN: 978-969-472-511-6

Pakistani Adab Kay Maimar
Khawaja Muhammad Zakariya: Shakhsiyat-aur-fun

Written By
Dr. Amjad Tufail

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Islamabad, Pakistan

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

ضمیمہ

پیش نامہ

ڈاکٹر خواجہ ذکریا ساٹھ برس کے لگ بھگ عرصے سے تدریس اردو ادب کے شعبے سے وابستہ ہیں جب کہ اس مدت میں سینکڑوں سکالرز کو ایم فل پی ایچ ڈی کروا چکے ہیں۔ آپ کو بجا طور پر استاد الاساتذہ کہا جاتا ہے۔ لیکن صرف تدریس ہی کے شعبہ میں آپ نے توقیر کا یہ درجہ حاصل نہیں کیا، تنقید اور تحقیق کے شعبہ میں بھی آپ کی کاوشیں علمی و ادبی حلقے میں نہایت اعتبار کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

آپ نے مجید امجد کے کلیات کی ترتیب و تدوین کا نہایت اہم ادبی کارنامہ سرانجام دیا اور یوں ایک درویش صفت اور خلوت پسند شاعر کے کلام کو منظر عام پر لانے کا ایک نہایت اہم فریضہ ادا کیا۔

ذاتی سطح پر بھی ڈاکٹر خواجہ ذکریا اعلیٰ بنیادی صفات کے حامل ہیں۔ اور ایک استاد کے طور پر بھی آپ کا اپنے شاگردوں سمیت بھی علما و فضلا سے رویہ نہایت مربیانہ اور مشفقانہ ہے۔ آپ کی شخصیت کی جاذبیت نے آپ کو ایک مقبول عام علمی و ادبی شخصیت کے درجہ پر فائز کیا ہے۔

ڈاکٹر امجد طفیل نے جس وقت نظری سے ڈاکٹر خواجہ ذکریا کی شخصیت و فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا اور ان کے علمی کام کی مختلف جہتوں پر تفصیل کے ساتھ بات کی ہے، اس سے ان کی علمی لیاقت اور وسعت نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ خود بھی ایک عمدہ کہانی کار اور محقق ہیں۔ امید ہے یہ کتاب خواجہ ذکریا کے فن کی تفہیم کے حوالے سے ایک بنیادی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لے گی۔

قارئین کرام کو ضرور ہماری یہ پیشکش اس سلسلے کی دیگر کتابوں کی طرح پسند آئے گی۔

ڈاکٹر یوسف خشک میرٹوریس پروفیسر
چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

پیش لفظ

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی شخصیت اور فن پر کتاب لکھنے کی پیش کش مجھے اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے جب موصول ہوئی تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس میں خواجہ صاحب کی ایما بھی شامل ہے۔ خواجہ محمد زکریا سے میرا تعلق کافی پرانا ہے۔ میں اگرچہ اُن کا باقاعدہ طالب علم تو نہیں رہا لیکن نجی محفلوں میں مجھے اُن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔

خواجہ محمد زکریا ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اُن پر کتاب کی تکمیل کے دوران ہوا۔ وہ ایک متحرک شخصیت ہیں اور ہمہ وقت لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اب جب کہ وہ اپنی زندگی کی اسّی سے زائد بہاریں دیکھ چکے ہیں اُن کی جولانیٔ طبع پوری طرح قائم ہے۔ اب بھی اُن کا حافظہ حیرت انگیز ہے۔ اُن کی شعر فہمی اعلیٰ نوعیت کی ہے اور ابھی کئی ایک علمی اور ادبی منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی سوانح بھی لکھ رہے ہیں۔

میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین ڈاکٹر یوسف خشک کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ہماری ادبی تاریخ کی ایک اہم شخصیت پر کتاب لکھنے کے لیے میرا انتخاب کیا۔ میں اپنے دوست ناول نگار اور مصور ریاظ احمد کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُن کے پیہم اصرار اور بار باری یاددہانیوں نے اس کتاب کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا۔ میں ریاظ صاحب کا اس لیے بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کے پروف بڑی محنت سے پڑھے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ قارئین کو میری یہ کاوش پسند آئے گی۔ مجھے آپ کی تنقیدی رائے کا انتظار رہے گا۔

ڈاکٹر امجد طفیل

باب اوّل

خواجہ محمد زکریا: حیات نامہ

قیام پاکستان سے قبل پنجاب ایک وسیع و عریض صوبہ تھا جس میں دو شہر لاہور اور امرتسر تہذیب و ثقافت کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے۔ امرتسر مشرقی پنجاب میں ادب و ثقافت کا اہم مرکز تھا۔ قیام پاکستان سے قبل سعادت حسن منٹو سے لے کر شہزاد احمد اور سیف الدین سیف سمیت بے شمار شاعر اور ادیب اسی مٹی سے اٹھے۔ ان میں اکثریت کشمیری مسلمانوں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ گورداسپور سے کشمیر سے براستہ گورداسپور جو راستہ پنجاب کو جاتا تھا اس پر پہلا اہم تہذیبی اور تجارتی مرکز امرتسر تھا۔ اس لیے کشمیر سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی بڑی تعداد اسی شہر میں مقیم ہو جایا کرتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد یہ لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور بہت بڑی تعداد میں لاہور میں آباد ہوئے۔

خواجہ محمد زکریا کشمیری النسل پنجابی مسلمان ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد انیسویں صدی کے وسط میں کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر میں آباد ہوئے۔ خواجہ محمد زکریا کے تایا زاد بھائی خواجہ غفور احمد نے ان کے ایک مکتوب کے جواب میں لکھا تھا:

"ہمارے آباؤ اجداد کشمیر کے گاؤں کے رہائشی تھے جسے ٹنچ گڑھ کہتے تھے اس لیے "ٹنچ گڑھیے صراف" کہلائے۔"

"بہت کم صراف مشرف بہ اسلام ہوئے.... صراف Non-Agriculturist ذات یا گوت ہے۔ یہ کشمیری پنڈت ہیں۔ صراف عربی زبان کا لفظ ہے جسے انگریزی میں Money Changer کہتے ہیں۔ یہ لفظ سنار کا مترادف نہیں ہے۔

"ہمارے یعنی آپ کے اور میرے پردادا اور ان کے بھائی جو پشمینہ شالوں اور دھسوں کا کاروبار کرتے تھے، امرتسر آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ دکان کڑہ آہلو والیاں میں تھی۔ جہاں سب ہندو دکاندار تھے..... امرتسر کے ایک معمر کشمیری میونسپل کمشنر (لالہ متو) نے مجھے ایک دفعہ کہا تھا کہ بھئی تمھارے

بزرگ بہت بڑے تاجر اور اصحابِ ثروت تھے۔ میں نے ان کا کاروبار دیکھا تھا۔ ہمارے پردادا اور ان کے بھائی کے نام تھے۔ خواجہ عزیز اللہ صراف اور خواجہ نبیر اللہ صراف غالباً اول الذکر ہمارے آپ کے پردادا تھے۔ ان بھائیوں کا کاروبار امرتسر اور کلکتے میں تھا..... یہ خاندان امرتسر کے چوک پراگداس کے علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ وہ ایک بڑی حویلی کے علاوہ کافی مکانوں کے مالک تھے۔ غالباً اڑوس پڑوس کے گھروں کے مالک ہوں گے۔ وہیں ایک گلی کا نام ''کوچہ عزیز بی بی'' تھا۔ یہ ہماری پردادی تھیں۔ معلوم نہیں کب کاروبار ختم ہوا اور کب اور کیوں جائیدادیں ہاتھوں سے نکلیں۔''(۱)

خواجہ محمد زکریا کے اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر میں آباد ہوئے یہاں انھوں نے کشمیری شالوں اور دھسوں کا کاروبار شروع کیا۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی۔ بقول خواجہ صاحب ان کے پردادا اور ایک اور بزرگ کا انتقال کلکتہ میں ہوا اور ان کی تدفین بھی وہیں ہوئی۔

خواجہ محمد زکریا کی پیدائش سرکاری کاغذات میں اندراج کے مطابق 23 مارچ 1940ء ہے۔ مقام ولادت امرتسر ہے۔ ان کے والد خواجہ غلام نبی (۱۹۰۳ء۔ ۱۲ مئی ۱۹۷۵ء) اور والدہ نثار فاطمہ (۱۹۰۶ء۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۹ء) دونوں کشمیری الاصل تھے۔ خواجہ غلام نبی اپنے آبائی پیشے سے وابستہ تھے۔ جبکہ والدہ اپنے زمانے کے لحاظ سے تعلیم یافتہ ہونے کے باعث امرتسر کے ایک سکول میں استانی تھی۔ خواجہ محمد زکریا کا اپنے سات بہن بھائیوں میں چھٹا نمبر ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز تو امرتسر شہر ہی سے ہوا۔ 25 اگست 1947ء میں وہ اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ان کا خاندان پہلے لاہور میں رہائش پذیر ہوا اور دو تین ماہ کے بعد جھنگ شہر میں آباد ہو گیا۔

امرتسر قیامِ پاکستان سے پہلے بہت اہم سیاسی و ادبی مرکز تھا۔ خواجہ محمد زکریا کے خاندان میں کاروبار کے ساتھ ساتھ علم کی روایت بھی موجود تھی۔ بقول خواجہ محمد زکریا ان کے دادا غلام محی الدین اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانیں جانتے تھے۔ ان کا تقرر تا حیات کشمیر ہاؤس میں بطور ''دیوانی وکیل'' رہا۔(۲) ان کے تایا زاد بھائی مختار احمد بہت اچھے شاعر تھے اور ناز تخلص کرتے تھے۔ مختار احمد کے چھوٹے بھائی منظور احمد اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کے ماہر تھے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے تھے۔ ان کے تیسرے بھائی خواجہ افتخار نامور مصنف تھے۔ خاص طور پر ''جب امرتسر جل رہا تھا'' ان کی بہت مشہور تصنیف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعروادب اور زبان دانی ان کا خاندانی وصف ہے۔

والدین

خواجہ محمد زکریا کے والد غلام نبی نے اپنی دو تین سال کی تعلیم ایک مسجد سے حاصل کی۔ وہ پنجابی، فارسی اور اُردو کے شعر بہت دلچسپی سے گنگنایا کرتے تھے۔ غلام نبی نے اپنی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رکھا اس کے دو اسباب تھے۔ ایک وہ رسمی تعلیم میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتے تھے۔ دوسرا ان کے والد یعنی خواجہ محمد زکریا کے دادا نے ایک اور شادی کر لی تو گھر کے معاشی معاملات کو بہتر انداز میں چلانے کے لیے اس بات کی ضرورت پڑی کہ غلام نبی کوئی کام کریں، انھوں نے آٹھ دس سال کی عمر میں محنت مزدوری شروع کر دی۔ بہت سے چھوٹے موٹے کام کیے۔ لانڈری کا کام کیا، رفو گری کی، مل مزدوری کی اس دوران تلاش روزگار میں لاہور چلے آئے اور پہلے ایبٹ روڈ اور پھر بیڈن روڈ پر رفو گری کا کام کرتے رہے۔ مارچ 1947ء میں جب فسادات شروع ہوئے تو وہ امرتسر واپس آ گئے۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے کنبے کے ساتھ پہلے لاہور آئے اور چند ماہ بعد جھنگ میں آباد ہوئے۔ پھر کراچی میں برآمدات کے کاروبار سے وابستہ ہوئے۔ چند سال بعد لاہور آ گئے۔ جاپان سے فاضل پرزہ جات (Spare Parts) کے کام کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا انتقال 1975ء میں ہوا۔ (۳)

خواجہ محمد زکریا کی والدہ نثار فاطمہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ ان کی عمر چند ماہ کی تھی جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ جب خواجہ زکریا کے نانا غلام قادر فوت ہوئے تو ان کے تین بچے تھے۔ دو لڑکوں کا انتقال 1908ء میں طاعون کی وبا کے دوران ہوا۔ اس طرح ماں بیٹی دنیا میں اکیلے رہ گئے۔ خواجہ زکریا کی نانی نے اپنی بیٹی نثار فاطمہ کی شادی کے لیے یہ شرط رکھی کہ لڑکا گھر داماد بننا قبول کرے۔ غلام نبی نے یہ شرط قبول کر لی۔ یوں دونوں کی شادی انجام پائی۔ نثار فاطمہ نے مڈل اور جے وی تک رسمی تعلیم حاصل کی تھی ان کی اُردو اور ریاضی میں خصوصی قابلیت تھی۔ وہ کبھی کبھی مصرعہ بھی موزوں کر لیتی تھیں۔ سکول میں پڑھاتی تھیں۔ پہلے امرتسر اور پھر جھنگ میں تدریس کی۔ ان کا انتقال 1969ء میں ہوا اور لاہور میں ان کی تدفین ہوئی۔ (۳)

بہن بھائی

خواجہ محمد زکریا اپنے سات بہن بھائیوں میں چھٹے نمبر پر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بہن کا نام فہمیدہ تھا اور ان کے شوہر کا نام غلام جیلانی تھا، انھوں نے میٹرک تک رسمی تعلیم حاصل کی اور پھر ادیب

عالم بھی کیا۔ انھیں بھی شعروشاعری سے شغف تھا۔ ان کا انتقال 60 سال کی عمر میں ہوا۔ ان کی دوسری بہن زکیہ کی شادی ظفر ڈار سے ہوئی۔ انھوں نے بھی میٹرک ایس۔ وی تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ساؤتھ افریقہ میں آباد ہو گئیں اور وہیں 2020ء میں انتقال ہوا۔ تیسری بہن فرحت تھیں۔ انھوں نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی پھر بی۔ ٹی کیا۔ ان کی شادی معروف سیاست دان خواجہ محمد رفیق سے ہوئی جن کو پیپلز پارٹی کے عہد میں 20 دسمبر 1972ء کو شہید کر دیا گیا۔ فرحت رفیق پہلے لاہور میونسپل کارپوریشن کی کونسلر اور پھر 1985ء میں پنجاب اسمبلی کی رکن رہیں۔ ان کے دو بیٹے خواجہ سعد رفیق اور خواجہ سلمان رفیق ملک کے نامور سیاستدان ہیں۔ (۵)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے سب سے بڑے بھائی غلام کبریا نے ریاضی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ زیادہ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور اور گورنمنٹ سائنس کالج وحدت روڈ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایچی سن کالج لاہور میں کئی سال ریاضی پڑھاتے رہے۔ بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر بہن عابدہ تھیں۔ انھوں نے فزکس میں ایم۔ ایس۔ سی تک تعلیم حاصل کی۔ لاہور کالج برائے خواتین میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ شادی کے بعد بیرون ملک چلی گئیں۔ پھر شوہر کے ساتھ سعودی عرب کی شہریت اختیار کر لی۔ شوہر انور علوی کے انتقال کے بعد لندن میں رہیں اور اب اپنے بیٹے کے ساتھ یو اے ای میں مقیم ہیں۔ خواجہ محمد زکریا کے سب سے چھوٹے بھائی آفتاب عالم ہیں۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف۔ ایس سی پری میڈیکل کے امتحان میں گولڈ میڈل لیا۔ کنگ ایڈورڈ کالج لاہور سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں بھی گولڈ میڈل لیا۔ ملازمت کے سلسلے میں امریکہ چلے گئے۔ نیو جرسی کے ایک ہسپتال میں چیف آف سرجری رہے اور ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کے فرائض بھی چند سال نبھائے۔ (۶)

پیدائش

خواجہ محمد زکریا اپنے والدین کی چھٹی اولاد تھے۔ ان سے تین بڑی بہنیں تھیں اور ایک بھائی تھا جبکہ ایک بھائی ان سے چھوٹا تھا۔ اپنے سن پیدائش کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ:

"میری میٹرک کی سند میں میری تاریخ ولادت 23 مارچ 1940ء درج ہے جو یقیناً درست نہیں،

تقسیم ملک کے بعد جب ہم لاہور میں چند ماہ گزار کر جھنگ (مگھیانہ) چلے گئے اور مجھے گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول میں داخل کرایا گیا تو میری والدہ کی ایک عزیزہ آپا صغریٰ عارضی طور پر گورنمنٹ گرلز ہائی میں ہیڈ مسٹریس کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ انھوں نے اندازاً مندرجہ بالا تاریخ ولادت لکھوا دی۔ غالباً انھیں معلوم ہوگا کہ قرارداد لاہور (قرارداد پاکستان) اسی روز منظور ہوئی تھی۔ میں نے بعد ازاں اپنی والدہ اور والد سے پوچھا کہ میری صحیح تاریخ ولادت کیا ہے۔ لیکن انھیں یاد نہیں تھا۔ بچپن میں ایک روایت سنی تھی کہ میں رمضان کی گیارھویں کو پیدا ہوا تھا اور غالباً سال 1938ء تھا۔ رمضان ۱۳۵۷ھ کو شمسی تقویم میں تبدیل کیا جائے تو ۴ نومبر ۱۹۳۸ء (بروز ہفتہ) حاصل ہوتا ہے۔ (۷)

والدین نے ان کا نام محمد زکریا رکھا جو امرتسر کے ایک مشہور سیاست دان خواجہ محمد زکریا کچلو کے نام پر رکھا گیا۔ ان کے بزرگوں نے جب اسلام قبول کیا تو ان کے نام کے ساتھ خواجہ لکھا جانے لگا۔ اسی نسبت سے لوگ ان کے والد غلام نبی کو خواجہ صاحب کہتے تھے۔ محمد زکریا نے اپنے کنبے کے بیشتر افراد کی طرح خواجہ کو اپنے نام کا حصہ بنا لیا اور وہ خواجہ محمد زکریا کے نام سے اہل علم و ادب میں جانے پہچانے لگے۔

موزونیِ طبع

خواجہ محمد زکریا نے اپنی پرائمری تعلیم کا آغاز امرتسر کے ایم۔ بی پرائمری سکول اندرون سلطان ونڈ گیٹ سے کیا۔ یہ سکول جلیانوالہ باغ سے متصل تھا۔ جہاں 1919ء میں جنرل ڈائر نے گولی چلا کر سینکڑوں ہندوستانیوں کو شہید کر دیا تھا۔ اس طرح ان کا سکول ایک تاریخی جگہ پر واقع تھا۔ سکھوں کا مقدس مقام دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) بھی قریب ہی تھا۔ (۸) یوں امرتسر کی تاریخی تہذیبی فضا میں خواجہ محمد زکریا کی ابتدائی تربیت ہوئی۔ خواجہ محمد زکریا کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ انھیں اپنے بچپن کی باتیں بڑی تفصیل سے یاد ہیں۔ وہ اپنے شہر کے ادبی ماحول کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"میرے محلے میں مشاعرے ہوتے تھے۔ جب رات جھکتی تھی تو لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ سڑک پر صفیں بچھا کر بیٹھ جاتے تھے۔ میرے محلے کے کئی نوجوان فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ ابوالکلام آزاد، سید عطا اللہ شاہ بخاری، منٹو کے رہنما باری علیگ سمیت بڑے سے بڑا صحافی ایسا نہیں جو امرتسر میں نہ رہا ہو۔ شعر و ادب، پہلوانی اور صحافت کا ذوق عام تھا۔" (۹)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ علم و ادب کی روایت خواجہ محمد زکریا کے خاندان میں موجود تھی۔ ان کے

تایازاد بھائی مختار احمد ناز بطور شاعر امرتسر میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ مختار احمد ناز بی۔ اے کرنے کے بعد روزگار کی تلاش میں کلکتہ چلے گئے اور اپنی چند شعری بیاضیں امرتسر میں ہی چھوڑ گئے۔ سات آٹھ سال کی عمر میں جب خواجہ محمد زکریا نے ان بیاضوں کا مطالعہ کیا تو نہ صرف انھیں مختار احمد ناز کے اشعار پڑھنے کو ملے بلکہ انھوں نے پہلی بار اقبال اور اختر شیرانی کے اشعار بھی اپنے تایازاد بھائی کی ایک بیاض میں پڑھے۔(۱۰)

خواجہ محمد زکریا کو موزونیٔ طبع اپنے والدین سے وراثت میں ملی۔ اس حوالے سے وہ خود کہتے ہیں:۔

"موزونیٔ طبع والدین سے ورثے میں ملی۔ دونوں کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی۔ ماں تو سکول میں استانی تھیں اور والد نے مکتب میں تھوڑی سی تعلیم حاصل کی تھی مگر انھیں فارسی، اُردو اور پنجابی کے بہت سے شعر یاد تھے۔ "مجھ" میں موزونیٔ طبع کا ورثہ موجود تھا۔"(۱۱)

اس سازگار علمی اور ادبی ماحول کے باعث اور قدرت کی جانب سے موزونیٔ طبع کا تحفہ ملا تھا۔ اس لیے انھوں نے امرتسر میں ہی شعر موزوں کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اگرچہ اس معاملے میں بقول خود انھیں کامیابی پاکستان میں آ کر ملی۔ اپنی شاعری کے آغاز کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بتایا:

"ایسا ہے کہ شاید شاعری قدرت نے میرے خمیر میں رکھ دی تھی۔ شاید لوگوں کو یقین نہیں آئے گا۔ میں جب تیسری جماعت میں تھا تو میں نے اپنے والد سے کہا کہ مجھے ایک کاپی لا دیں میں شعر لکھوں گا۔ تو انھوں نے کاپی لا دی۔ شعر تو کیا ہوتے تھے، لیکن میں اپنی طرف سے کوشش کرتا تھا کہ میں کچھ لکھوں گا۔ تو ظاہر ہے کہ بے وزن تھے پھر چوتھی، پانچویں میں یہ تھا کہ مجھے شعر بہت جلدی یاد ہو جاتے تھے۔ میں جب چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا تو میں گرلز سکول میں چھ مہینے رہا۔ جنگ کے گرلز سکول میں بچوں سے ملتے میں ایک دن نظمیں سنتی تھیں اُردو کی کلاس میں وہ کہتی تھیں: چلیں نظم سنائیں۔ تو بچے پورا سال ایک ہی نظم سناتے رہتے، میں ہر دفعہ نئی نظم سناتا تھا۔ یعنی اس وقت بھی مجھے اتنی شاعری یاد تھی اور جب میں چھٹی، ساتویں، آٹھویں میں گیا تو میں باقاعدہ وزن میں شعر لکھ لیتا تھا اور اس زمانے کی اپنی شاعری میرے پاس موجود ہے، جیسی بھی ٹوٹی پھوٹی ہے۔(۱۲)

تعلیم

خواجہ محمد زکریا نے تیسری کلاس تک تعلیم امرتسر سے حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے والدین لاہور چلے آئے اور گوالمنڈی میں ان کے والد کو ایک مکان الاٹ ہو گیا۔ دو تین ماہ لاہور میں قیام کے بعد ان کے والدین نے جھنگ جانے کا فیصلہ کیا۔ انھیں جھنگ میں چوتھی جماعت میں داخل کروایا گیا۔ پانچویں جماعت انھوں نے اسلامیہ سکول جھنگ سے 1949ء میں پاس کی اور پھر میٹرک 1954ء میں نمایاں حیثیت سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد انھیں گورنمنٹ کالج جھنگ میں داخل کروایا گیا۔ والدین کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا میڈیکل کی تعلیم حاصل کرے لیکن انھیں طب کی تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے یہ دو سال کرکٹ کھیلنے اور شعر موزوں کرنے میں گزار دیے۔ چوں کہ انھوں نے کتابیں کھول کر دیکھی تک نہ تھیں اس لیے امتحان کے نزدیک امتحانی بیماری (Examination Sickness) کا شکار ہو گئے اور امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ (۱۳)

خواجہ محمد زکریا نے 1958ء میں بطور پرائیویٹ طالب علم ایف۔ اے کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ انٹر کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے (آنرز) میں داخلہ لیا اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ اردو آپشنل کے پرچے میں 50 میں سے 48 نمبر حاصل کیے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگریزی میں داخلے کے لیے تحریری امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ چوں کہ انھیں زیادہ دلچسپی اُردو ادب میں محسوس ہوتی تھی اس لیے اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے اُردو میں داخلہ لیا۔ ایم اے اُردو کے امتحان میں 700 میں سے 493 نمبر لے کر ریکارڈ قائم کیا اور یونیورسٹی گولڈ میڈل کے حق دار قرار پائے۔ ایم۔ اے اُردو کی تکمیل کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر نگرانی "اردو میں قطعہ نگاری" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ بھی تحریر کیا۔ (۱۴)

دوران ملازمت خواجہ محمد زکریا نے 1973ء میں اورینٹل کالج لاہور ہی سے ہندی زبان میں دو سالہ ڈپلوما حاصل کیا۔ اور 1974ء میں "اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کے زیر عنوان ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی زیر نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا اور ڈگری حاصل کی۔ خواجہ صاحب نے ناظرہ قرآن مجید امرتسر میں اپنے محلے کی مسجد کے امام سے پڑھا۔ ساڑھے چھ سال یا سات سال تک وہ قرآن مجید مکمل طور پر ناظرہ پڑھ چکے تھے۔ پھر بہت سی دینی کتب اپنی دلچسپی سے عمر بھر پڑھتے رہے۔ (۱۵)

اگر ہم خواجہ محمد زکریا کی تعلیمی ترقی اور ان کی شاعری سے رغبت کے سفر پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں اندازہ

ہوتا ہے کہ شعر و ادب کے لیے ملکہ انھیں قدرت نے مہیا کیا تھا اور اس کی پرداخت کے لیے سازگار حالات بھی قدرت ہی نے مہیا کیے۔ ان کے والد اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر شاعری سے قدرتی دلچسپی رکھتے تھے۔ والدہ تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھیں اور اردو شاعری اور ادب سے بہت رغبت رکھتی تھیں۔ انھیں امرتسر اور جھنگ جیسے شعر و ادب کے مراکز میں ابتدائی زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ جھنگ (مگھیانہ) کے جس سکول میں وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل کروائے گئے۔ وہاں ہفتے میں ایک دن بزم ادب کا ایک پیریڈ ہوتا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی نصابی کتاب میں موجود تمام نظمیں یاد کر رکھی تھیں جنھیں وہ اپنے استاد کے کہنے پر سنایا کرتے تھے۔ وہ بیت بازی کے مقابلوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے اور ہمیشہ سب سے آگے رہتے۔ آٹھویں جماعت تک وہ شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ نویں جماعت میں انھوں نے باقاعدہ کلام موزوں کہنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک ہم جماعت عبد القدوس کے بار بار تخلص تبدیل کرنے کے حوالے سے یہ قطعہ لکھا

غالباً چوتھی جماعت تک ریاض ہوتا تھا اسم گرامی آپ کا
بعد میں قدوس صاحب بن گئے پھر تخلص آپ کا شمیم ہوا
شمیم اشرف آپ ہیں بن بیٹھے اب واہ یہ تو کھیل سا ہے بن گیا

دسویں جماعت میں پڑھتے تھے جب خواجہ محمد زکریا کی شاعری بچوں کے مشہور رسالے "تعلیم و تربیت" اور "کھلونا" میں شائع ہونے لگی۔ اس زمانے میں یہ بچوں کے بڑے معیاری رسالے سمجھے جاتے تھے اور خود راقم یہ جانتا ہے کہ 1970ء کی دہائی تک بھی یہ رسالے بچوں میں بڑے مقبول تھے اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے والدین اپنے بچوں کو انھیں پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے۔

ایف۔ اے کے برسوں میں انھوں نے چوں کہ اپنا وقت کرکٹ کھیلنے میں گزارا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب میں دلچسپی لیتے رہے تھے اس لیے وہ جھنگ شہر میں نوجوان لکھنے والے کے طور پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان دنوں جھنگ میں شیر افضل جعفری، پروفیسر تقی انجم، پروفیسر جابر علی سید، طاہر سردھنوی، رفعت سلطان، بیدل پانی پتی، اور مظفر علی ظفر جیسے شعرا موجود تھے جن کی بدولت جھنگ میں ادبی اور شعری فضا نہایت دلکش اور خوبصورت تھی۔ ان بزرگ لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہم عصروں میں صفدر سلیم سیال، رام ریاض، نذیر ناجی اور عباس اطہر جیسے شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے موجود تھے۔ جھنگ کی ادبی اور شعری پہچان مجید امجد اور جعفر طاہر اگرچہ ملازمت کے

سلسلے میں جھنگ سے باہر رہتے تھے لیکن شہر میں ان کی آمد وقتاً فوقتاً جاری رہتی اور ان کے اعزاز میں تقریبات کا سلسلہ بھی چلتا رہتا۔

خواجہ محمد زکریا اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی مجید امجد سے پہلی ملاقات جھنگ میں شیر محمد شعری کے ہاں 1957ء میں ہوئی۔ مجید امجد کی بے نیاز طبیعت اور منفرد شاعری نے انھیں بہت متاثر کیا۔ پھر ہر ملاقات کے ساتھ یہ اثر گہرا ہوتا چلا گیا اور پھر گہری عقیدت میں ڈھل گیا۔ خواجہ محمد زکریا نے اس زمانے کے رواج کے مطابق باقاعدگی سے تو کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا مگر غیر رسمی انداز میں شیر افضل جعفری، پروفیسر جابر علی سید اور پروفیسر تقی انجم کی تربیت سے استفادہ کیا۔

1950ء کی دہائی میں جھنگ میں شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے احباب نے ایک ادبی تنظیم مجلس اقبال بنا رکھی تھی۔ یہ تنظیم مشاعروں اور مختلف ادبی تقریبات کا انعقاد کرتی رہتی تھی۔ اس کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے مقامی زمیندار اور تاجر چندہ دیا کرتے تھے۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں میں عبدالحمید عدم اور حبیب جالب جیسے شعرا بھی شریک ہوتے تھے۔ خواجہ زکریا کو مجلس اقبال کے جنرل سکریٹری کے طور پر کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ اسی دوران وہ جھنگ اور قریبی شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے اور ان کی تخلیقات مختلف اخبارات جیسے "غریب" فیصل آباد اور "عوام" فیصل آباد میں شائع ہوتی رہیں۔

اپنے اس تعلیمی اور شعری پس منظر کے ساتھ جب خواجہ محمد زکریا نے 1958ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے (آنرز) میں داخلہ لیا تو انھیں اردو آپشنل میں قیوم نظر جیسے استاد اور شاعر کی سرپرستی میسر آئی۔ قیوم نظر حلقہ ارباب ذوق لاہور کے بنیاد گزاروں میں تھے اور 1950ء کی دہائی میں وہاں ان کا طوطی بولتا تھا۔ انھوں نے خواجہ محمد زکریا کی بہت حوصلہ افزائی کی اور انھیں حلقہ ارباب ذوق لاہور اور دیگر ادبی تنظیموں میں متعارف کروایا۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور بھی اہم ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ کالج سے "راوی" مستقل اور باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ خواجہ محمد زکریا کی کئی غزلیں "راوی" میں شائع ہوئیں اور انھیں بہترین غزل لکھنے پر 25 روپے کا انعام بھی ملا۔ بقول خواجہ محمد زکریا انھوں نے اس 25 روپے سے "جاوید نامہ"، "نظر نامہ"، "تجلیے"، اور "خرابات" جیسی کتابیں خریدیں اور یوں اپنے شعری ذوق کی تسکین کی۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے آنرز کرنے کے بعد خواجہ محمد زکریا نے اپنے خاندان کی مرضی کے

برعکس ایم۔اے اُردو میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ان کے خاندان کی خواہش تھی کہ وہ ایم اے انگریزی کر کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں اور سرکاری افسر بنیں۔ خواجہ محمد زکریا کو اُردو شعروادب سے دلچسپی تھی اور وہ اپنا مستقبل بھی اُردو ادب سے وابستہ کرنے کے آرزومند تھے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج لاہور کا ماحول بھی شعروشاعری سے معمور تھا۔ ان کے ساتھ پڑھنے والوں میں خورشید رضوی (عربی)، انور مسعود (فارسی)، اسلم انصاری، عابد صدیق اور انوار انجم (اُردو) قابلِ ذکر طلبا تھے جنھوں نے شعروادب میں اپنا نام پیدا کیا۔ اُردو کی ممتاز افسانہ نگار خالدہ اصغر (بعد میں خالدہ حسین) بھی ان کی کلاس فیلو تھیں۔ اورینٹل کالج میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے خواجہ محمد زکریا علمی اور تحقیقی کتب کے مطالعہ میں زیادہ محو رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ شاعری سے دور ہوتے گئے۔ انھوں نے ایم۔اے اُردو کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اس میں دوسری پوزیشن اسلم انصاری اور تیسری پوزیشن خالدہ اصغر کی تھی۔ خواجہ محمد زکریا نے ایم۔اے میں یونیورسٹی میں نمبر حاصل کرنے کا نیا ریکارڈ تو قائم کر دیا مگر اس کی قیمت انھیں شاعری سے دوری کی صورت میں ادا کرنا پڑی اور خود ان کے اپنے بقول اورینٹل کالج ان کی شاعری کو کھا گیا۔

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے اُردو میں داخلہ لینے سے ان کے مستقبل کی راہیں متعین ہو گئیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے زیرِ اثر وہ تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہوتے چلے گئے اور بلاشبہ انھوں نے اس میدان میں نام پیدا کیا۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اگر تحقیق و تنقید کی طرف نہ آتے تو اُردو ادب ایک مستند محقق اور نکتہ رس نقاد سے محروم رہ جاتا۔

ملازمت

چوں کہ خواجہ محمد زکریا نے ایم۔اے اُردو کے میدان میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔ اس لیے انھیں جلد ہی گورنمنٹ کالج لاہور جیسے ادارے میں لیکچرر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ ستمبر 1962ء میں اپنی ملازمت کے آغاز سے انھیں ایک بے تکلف دوست مرزا محمد منور کی رفاقت میسر آئی۔ مرزا محمد منور ہی کی وساطت سے خواجہ محمد زکریا کی ملاقات نابغۂ روزگار شاعر حفیظ جالندھری سے ہوئی۔ ایک سال کے بعد 1963ء میں خواجہ محمد زکریا شعبۂ اُردو اورینٹل کالج، یونیورسٹی آف پنجاب میں لیکچرر مقرر ہوئے اور یہاں اورینٹل کالج سے ان کی عمر بھر کی رفاقت اور محبت کا آغاز ہوا جو تا حال جاری ہے اور امید کی جا

سکتی ہے کہ یہ تہ حیات جاری رہے گا۔

خواجہ محمد زکریا نظم وضبط سے زندگی گزارنے والے فرد ہیں۔ ان کی شخصیت میں تنظیم کے ساتھ ساتھ توازن بھی ملتا ہے۔ اس نے ان کے تحقیق اور تنقید کے پہلو کو بہت مدد دی ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے شاندار مدرسانہ زندگی گزاری ہے۔ وہ ہر دور میں اپنے شاگردوں میں ہر دل عزیز رہے ہیں۔ انھیں اپنے رفقاء اور دوستوں کی محبت بھی حاصل رہی ہے۔ اور وہ اپنی ملازمت کی منازل بڑی یکسوئی سے طے کرتے رہے ہیں۔ 1970ء میں وہ اسسٹنٹ پروفیسر منتخب ہوئے اور 1977ء میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بن گئے۔ اس دوران وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر چکے تھے یوں اب وہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بن چکے تھے۔ کامیابی کا یہ سفر جاری وساری رہا۔ یکم فروری 1979ء میں انھیں پروفیسر شعبہ اُردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان منتخب کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ وہ صدر شعبہ اُردو اور ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ لینگوئجز کے منصب پر بھی فائز ہوئے۔ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا بہاء الدین یونیورسٹی میں مختصر قیام یکم فروری 1979ء سے 31 دسمبر 1979ء تک صرف گیارہ ماہ کے لیے رہا لیکن انھوں نے اپنی صلاحیتوں کی بدولت شعبہ اُردو کو ایک شکل دی۔ اے۔ بی اشرف اور انوار احمد جیسے صاحبان کو ڈاکٹریٹ کی طرف راغب کیا اور ان کا نگران بننا قبول کیا۔ ڈاکٹر انوار احمد نے 31 اگست 2018ء کو فیس بک کے اپنے اکاؤنٹ پر اس دور کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا پی ایچ ڈی کے مقالے کے میرے نگران رہے۔ جب ملتان یونیورسٹی کا شعبہ اُردو ابتدائی مرحلے میں تھا۔ وہ ہمارے صدر شعبہ اُردو اور ڈین آف فیکلٹی رہے۔

خواجہ محمد زکریا ملتان میں اپنے مختصر قیام کے حوالے سے کئی مجلس یاروں بھی کبھی اپنے احباب کے گوش گزار کرتے رہتے ہیں۔ ملتان کو چھوڑنے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے خاندان سے دور تھے اور ملتان میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس حوالے سے خود خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

"1979ء میں فل پروفیسر کے طور پر ملتان یونیورسٹی چلا گیا۔ ایک سال وہاں صدر شعبہ اور ڈین آف فیکلٹی رہا لیکن وہاں میرا دل نہیں لگتا تھا کیوں کہ میرے گھر والے یہاں تھے۔ اس لیے ایک سال بعد استعفیٰ دے کر واپس پنجاب یونیورسٹی لاہور آ گیا۔ یہاں انھیں ۱۹۸۳ء میں پروفیسر منتخب کر لیا گیا۔ ۱۹۸۳ء میں وہ صدر شعبہ اُردو بن گئے اور نو سال تک اس حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ فروری ۱۹۹۲ء میں ان کا تقرر بطور ماہر مضمون اُردو، چین کی پیکنگ یونیورسٹی میں ہوا۔ یہاں انھوں نے

۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء تک خدمات سرانجام دیں۔ پیکنگ یونیورسٹی میں وہ طلبا کو اُردو سکھاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو زبان میں غیر ملکیوں کے لیے تدریس کے حوالے سے نصابی مواد اور کتب بھی تیار کرتے رہے۔ اس دور کی یادگار ان کی آٹھ کتابیں سے پیکنگ یونیورسٹی والے اب بھی استفادہ کر رہے ہیں۔

اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی میں خواجہ محمد زکریا ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۹ء تک شعبہ ہندی اور ۱۹۸۷ء سے ۱۹۸۹ء تک شعبہ کشمیریات میں بھی تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۰ء میں سول سروسز اکیڈمی میں ایک سال تک دفتری اُردو بھی پڑھائی۔ یوں خواجہ صاحب کو کئی ایک شعبوں میں پڑھانے کا منفرد تجربہ حاصل ہوا۔ اس حوالے سے وہ خود بتاتے ہیں۔

"شعبہ کشمیریات اور شعبہ ہندی، پنجاب یونیورسٹی میں دو دو سال تدریس کی اور ایک سال سول سروسز اکیڈمی لاہور میں دفتری اُردو پڑھائی۔

۱۹۹۳ء میں وطن واپسی پر انھوں نے دوبارہ اورینٹل کالج میں اپنی تعلیمی خدمات کا آغاز کیا۔ اور وہاں انھوں نے اورینٹل کالج کے پرنسپل اور ڈین آف فیکلٹی کے طور پر ۱۹۹۵ء تک خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران انھیں جاپان میں اُردو پڑھانے کی پیش کش ہوئی جسے انھوں نے قبول کر لیا اور وہ چار سال تک جاپان میں اُردو زبان کی تدریس کرتے رہے۔ جاپان کا قیام اس حوالے سے ان کے لیے خوش قسمتی کا باعث ہوا کہ تنہائی اور فرصت کے طویل اوقات نے ان کے اندر کے شاعر اور تخلیق کار کو جگا دیا وہ شاعری کی طرف واپس آئے اور اب تک ان کے دو شعری مجموعے "آشوب" (۲۰۱۱ء) اور "اقبال" (۲۰۱۹ء) شائع ہو چکے ہیں۔

وطن واپسی پر انھوں نے یکم اپریل ۱۹۹۹ء میں ایک بار پھر بطور پرنسپل اورینٹل کالج اپنے کام کا آغاز کیا۔ اور ۲۲ مارچ ۲۰۰۰ء تک خوش اسلوبی سے اپنے تدریسی اور انتظامی امور کو سرانجام دیتے رہے۔ خواجہ محمد زکریا ۱۰ ستمبر ۲۰۰۰ء کو لاہور کے معروف ایچی سن کالج میں استاد مقرر ہوئے اور ۲۸ فروری ۲۰۰۳ء تک اس ادارے میں تدریس اور اُردو کے اساتذہ کی تربیت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں انھوں نے ایک سال ایم۔اے اور ایم فل کی تدریس کی۔

پنجاب یونیورسٹی نے خواجہ محمد زکریا کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۱۰ء میں انھیں اُردو زبان و ادب کا پروفیسر ایمریٹس (Emeritus) مقرر کیا۔ ۲۰۰۹ء میں انھیں ڈائریکٹر شعبہ تاریخ ادبیات کی خدمات بھی تفویض کی گئیں۔ انھوں نے چھ سال کی مختصر مدت میں پنجاب یونیورسٹی کے عظیم

کام "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" کو از سرِ نو مرتب کیا۔ پہلے اس منصوبے کے نگران فیاض محمود تھے۔ خواجہ محمد زکریا نے اُردو زبان و ادب کی ان پانچ جلدوں کی چھ جلدوں میں از سرِ نو تدوین کی۔ ابواب کی نئی درجہ بندی کی۔ نیا مواد شامل کیا اور جو اغلاط پہلے ایڈیشن میں موجود تھیں ان کی اصلاح کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک ضخیم جلد میں ان چھ جلدوں سے استفادہ کرتے ہوئے "مختصر تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند" تالیف کی۔ اگر غور سے اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریباً خواجہ محمد زکریا کا اپنا کام ہے اور منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

خواجہ محمد زکریا نے اپنی ساری زندگی تدریس و تحقیق میں بسر کی۔ جامعہ پنجاب کا اورینٹل کالج اور اس کالج کا شعبۂ اُردو ان کی زندگی کا محور رہا۔ اس کالج سے کئی ایک تحقیقی رسالے بھی شائع ہوتے ہیں ان میں سے ایک کا نام "اورینٹل کالج میگزین" ہے اور اس میں اورینٹل کالج کے تمام شعبوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ آپ پہلے ۹۵۔۱۹۹۳ اور پھر ۱۹۹۹۔۲۰۰۰ء تک اس کے مدیر رہے ہیں۔ اسی طرح جب وہ ۹۵۔۱۹۹۳ء میں ڈین آف فیکلٹی تھے تو فیکلٹی کے "مجلۂ تحقیق" کے مدیر بھی رہے۔ اُردو بورڈ آف سٹڈیز کے رکن کے فرائض ۹۵۔۱۹۸۳ء تک ادا کیے۔ اس کے علاوہ بہت سے علمی ادارے جیسے مجلس ترقی ادب لاہور، اقبال اکادمی لاہور اور بزمِ اقبال لاہور کے بورڈ آف گورنرز/ ڈائریکٹرز کا حصہ رہے ہیں۔ حلقہ اربابِ ذوق لاہور کے رکن، پاکستان رائٹرز گلڈ کے رکن، اکیڈمی آف لیٹرز کے رکن، جامعہ پنجاب کے بورڈ آف ایڈوانس سٹڈیز اور ریسرچ کے رکن اور جامعہ پنجاب کی اکیڈمک کونسل کے رکن رہنے کا موقع بھی انھیں ملا۔ اور اپنی ان تمام حیثیتوں میں انھوں نے قابلِ قدر کام کیے۔

خواجہ صاحب بعض ادبی و علمی رسائل کی مجلس مشاورت کا حصہ بھی رہے ہیں۔ اس میں سرور اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والا رسالہ اور بزمِ اقبال لاہور کے زیرِ اہتمام چھپنے والا علمی رسالہ "اقبال" شامل ہیں۔ اسی طرح آپ "دائرہ معارف اسلامیہ اقبال" کی مجلس مشاورت کا بھی حصہ رہے ہیں۔

شادی

عام طور پر خواجہ محمد زکریا کو ایک علمی شخصیت ہونے کے اعتبار سے "غیر رومانی" قرار دیا جاتا ہے۔ مگر ان کے قریب رہنے والے دوست جانتے ہیں کہ معاملہ ایسا بھی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا پہلا رومانس بڑے زبردست انداز میں کیا اور شگفتہ حیات دونوں خاندانوں کی مرضی سے شگفتہ زکریا

بن گئیں۔ اکثر محبت میں شادی کو محبت کی ناکامی قرار دیا جاتا ہے لیکن خواجہ محمد زکریا کی 53 سالہ خوشگوار اور قابلِ رشک ازدواجی زندگی اس کلیے کی نفی کرتی ہے۔

خواجہ محمد زکریا جب محبت کے تجربے سے گزر رہے تھے۔ اس عہد کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ان کے دیرینہ دوست ڈاکٹر انور محمد خالد لکھتے ہیں:

''اس راز کو کون مردِ فرنگی فاش کرے گا؟ دروغ برگردنِ راوی۔ ڈاکٹر صدیق جاوید بتایا کرتے ہیں کہ شادی سے کچھ عرصہ پہلے خواجہ محمد زکریا بہت اداس اداس پھرا کرتے تھے۔ ان دنوں ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر ان کے شب و روز کا رفیق تھا جسے وہ ہر وقت کان سے لگائے رہتے تھے اور پرانی انڈین فلموں کے المیہ گانے سنتے رہتے تھے۔''

جس محبت اور ذمہ داری سے ڈاکٹر انور محمد خالد نے ایک نازک صورتِ حال کا بیان کیا وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ اپنی شادی کے حوالے سے وہ خود تحریر کرتے ہیں:

''میری شادی ۱۹۶۸ء میں ہوئی اور یقیناً یہ پسند کی شادی تھی کیوں کہ میں اس شادی کے حق میں بالکل نہیں ہوں جو سو فیصد والدین کی مرضی سے کی جائے۔ جن لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنی ہے انھیں کم از کم یہ حق ضرور ہونا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ جانتے ہوں۔ مغرب کی طرح شادی سے پہلے ڈیٹنگ کا ہرگز قائل نہیں ہوں۔ لیکن اگر ایک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں تو اس پر والدین کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے بشرطیکہ دونوں میں کوئی سنگین قابلِ اعتراض بات نہ ہو۔''

خواجہ محمد زکریا زندگی میں ایک ہی بار محبت کے تجربے سے گزرے۔ انھوں نے اپنی طالبہ سے والدین کی مرضی سے شادی کی۔ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے اندر احساسِ جمال رکھتے ہیں۔ خوبصورتی انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں محبت کے تجربے کے بارے میں ہمارے دوست ریاظ احمد کے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا:

''میں انسانی زندگی میں محبت کے تجربے کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ ہر انسان اپنی زندگی میں ایک محبت ضرور کرتا ہے بلکہ بہت سے تو ایک سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ میرے خیال میں انسان اپنی زندگی میں ایک سے زیادہ بار محبت کر سکتا ہے لیکن ہماری ثقافت میں اسے شادی ایک ہی کرنی چاہیے۔''

خود خواجہ صاحب اپنی زندگی میں محبت کے تجربے سے ایک بار گزرے یا ایک سے زیادہ بار اس

کے بارے میں کچھ یقین سے کہنا مشکل ہے ان کے مجموعے "آشوب" میں شامل ایک دو نظمیں محبت کے کسی تازہ جھونکے کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ بطور ادب اور نفسیات کے طالب علم کی حیثیت سے میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ بہت سے لوگ جمال پرست ہوتے ہیں لیکن ہوس پرست نہیں ہوتے اور نہ ہی ہر عورت کو دیکھ کر ان کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا حسن پرست تو ضرور ہیں ہوس پرست ہرگز نہیں۔

ہماری تہذیب میں کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت اچھے اور دل پسند میاں بیوی کا ملنا ہے۔ اس اعتبار سے خواجہ محمد زکریا اور ان کی زوجہ شگفتہ زکریا دونوں کو اللہ نے اس نعمت سے نوازا ہے۔ شگفتہ زکریا خود بھی ایک پڑھی لکھی، سلیقہ شعار اور دلکش شخصیت کی مالک ہیں۔ انھوں نے اورینٹل کالج سے ایم اے اردو کرنے کے بعد شعبۂ تعلیم حکومت پنجاب میں بطور لیکچرر اردو اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے انھیں ۱۹۹۲ء میں "ولی اللہ محب کے دیوان کی تدوین" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند سے نوازا گیا۔ انھوں نے کافی عرصہ لاہور کالج برائے خواتین میں پڑھایا۔ لیکچرر سے اسسٹنٹ پروفیسر پھر ایسوسی ایٹ پروفیسر اور فل پروفیسر تک ترقی پائی۔ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو اور ڈین آف فیکلٹی کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ ۲۰۰۶ء میں اپنی مدت ملازمت کامیابی سے مکمل کرنے کے بعد سبکدوش ہوگئیں۔ اب دونوں میاں بیوی ایک خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اولاد

اللہ تعالیٰ نے خواجہ محمد زکریا اور شگفتہ زکریا کو خوبصورت، قابل اور پڑھی لکھی اولاد سے نوازا ہے۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے کا نام فواد زکریا ہے۔ وہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ پاکستان سے ثانوی تعلیم حاصل کر کے امریکہ چلے گئے۔ امریکہ سے فلاڈلفیا یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ اے کیا۔ امریکہ ہی میں مختلف جگہوں پر کام کیا۔ آج کل کیلی فورنیا میں ایک جرمن کمپنی کے وائس چیئرمین ہیں۔ وہ شادی شدہ ہیں اور ان کے دو بچے ہیں۔

دوسرے بیٹے کا نام خواجہ جواد زکریا ہے جو ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے پہلے پنجاب یونیورسٹی روچسٹر یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا پھر امریکہ سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسلام

کے بارے میں کچھ یقین سے کہنا مشکل ہے ان کے مجموعے "آشوب" میں شامل ایک دو نظمیں محبت کے کسی تازہ جھونکے کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ بطور ادب اور نفسیات کے طالب علم کی حیثیت سے میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ بہت سے لوگ جمال پرست ہوتے ہیں لیکن ہوس پرست نہیں ہوتے اور نہ ہی ہر عورت کو دیکھ کر ان کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا حسن پرست تو ضرور ہیں ہوس پرست ہرگز نہیں۔

ہماری تہذیب میں کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت اچھے اور دل پسند میاں بیوی کا ملنا ہے۔ اس اعتبار سے خواجہ محمد زکریا اور ان کی زوجہ شگفتہ زکریا دونوں کو اللہ نے اس نعمت سے نوازا ہے۔ شگفتہ زکریا خود بھی ایک پڑھی لکھی، سلیقہ شعار اور دلکش شخصیت کی مالک ہیں۔ انھوں نے اورینٹل کالج سے ایم اے اردو کرنے کے بعد شعبۂ تعلیم حکومت پنجاب میں بطور لیکچرر اردو اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے انھیں ۱۹۹۲ء میں "ولی اللہ محب کے دیوان کی تدوین" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند سے نوازا گیا۔ انھوں نے کافی عرصہ لاہور کالج برائے خواتین میں پڑھایا۔ لیکچرر سے اسسٹنٹ پروفیسر پھر ایسوسی ایٹ پروفیسر اور فل پروفیسر تک ترقی پائی۔ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو اور ڈین آف فیکلٹی کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ ۲۰۰۶ء میں اپنی مدت ملازمت کامیابی سے مکمل کرنے کے بعد سبکدوش ہوگئیں۔ اب دونوں میاں بیوی ایک خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اولاد

اللہ تعالیٰ نے خواجہ محمد زکریا اور شگفتہ زکریا کو خوبصورت، قابل اور پڑھی لکھی اولاد سے نوازا ہے۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے کا نام فواد زکریا ہے۔ وہ ٦ ار اکتوبر ۱۹۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ پاکستان سے ثانوی تعلیم حاصل کر کے امریکہ چلے گئے۔ امریکہ سے فلاڈلفیا یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ اے کیا۔ امریکہ ہی میں مختلف جگہوں پر کام کیا۔ آج کل کیلی فورنیا میں ایک جرمن کمپنی کے وائس چیئرمین ہیں۔ وہ شادی شدہ ہیں اور ان کے دو بچے ہیں۔

دوسرے بیٹے کا نام خواجہ جواد زکریا ہے جو ۵ار اکتوبر ۱۹۷۲ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے پہلے پنجاب یونیورسٹی روچسٹر یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا پھر امریکہ سے ایم۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسلام

آباد میں Jazz میں منیجر رہے۔ برطانیہ میں ملازمت کرتے رہے اور آج کل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاہور میں مقیم ایک کمپنی میں منیجر ہیں۔ ان کے بھی دو بچے ہیں۔

ان کی تیسری اور سب سے چھوٹی اولاد صباحت زکریا ۲۳ فروری ۱۹۷۸ء میں پیدا ہوئیں۔ کنیئرڈ کالج لاہور میں پڑھا جہاں سے انگریزی میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ ایچی سن کالج میں استاد رہی ہیں۔ صحافی کے طور پر ڈیلی ڈی نیشن اور فرائڈے ٹائمز سے وابستہ رہیں دیگر اخبارات میں لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اپنے شوہر اور اکلوتے بیٹے کے ساتھ نیویارک میں مقیم ہیں۔ نیویارک یونیورسٹی سے جرنلزم میں ایم۔ اے بھی کیا۔

خواجہ محمد زکریا کو جب ۲۰۰۸ء میں مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کا جنرل سیکرٹری بنایا گیا تو انھوں نے اکیڈمی کے دفتر کو لاہور کے دور افتادہ مقام سے شہر کے مرکز میں منتقل کیا۔ اکیڈمی کی کتب کی فروخت جو کہ نہ ہونے کے برابر تھی اسے دو لاکھ سالانہ کے قریب لے گئے۔ اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتب کی اشاعت کو بہتر بنایا۔ کتب کے علمی ادبی معیار میں اضافہ کیا اور یہ سب انھوں نے یک و تنہا کیا۔ اکیڈمی کے محدود وسائل کی وجہ سے دو جز وقتی ملازمین ہی کام کرتے ہیں۔ کتاب کی اشاعت میں مسودے کے انتخاب سے لے کر طباعت کے تمام مراحل کی نگرانی خواجہ محمد زکریا خود کرتے ہیں۔

حالیہ معاملات

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اپنی زندگی کی 83 بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ لاہور کے سرسبز و شاداب علاقے کینٹ میں ایک خوبصورت رہائش گاہ میں اپنی بیوی شگفتہ زکریا کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے گھر میں موجود وسیع لائبریری اور اس لائبریری میں مختلف موضوعات پر موجود کتابیں ان کے وسیع المطالعہ ہونے کی گواہ ہیں۔ ان کے لکھنے کی میز پر ہر وقت تحقیق و تنقید سے وابستہ مواد موجود رہتا ہے۔ نئے شائع ہونے والے تخلیقی مجموعے ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی لائبریری میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا ایک انتھک انسان ہیں۔ تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شاعروں کے کلیات مرتب کرنے میں انھیں ملکہ حاصل ہے۔ پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، شعبہ اُردو سے پروفیسر ایمریٹس کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ ہفتے میں دو دن اورینٹل کالج آتے ہیں۔ طلباء کو کلاسیں پڑھاتے

ہیں۔ اپنے کمرے میں طلبا کے علمی ذوق کی تشفی کرتے ہیں۔ 2011ء میں انھیں صدرِ پاکستان کی طرف سے تمغۂ حسنِ کارکردگی (Pride of Performance) بھی ملا ہے۔

''مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی'' ایک معتبر ادارہ ہے۔ جو ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی اس کے جنرل سیکرٹری بنے اور اب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ ہفتے میں دو تین دن سہ پہر کے وقت اکیڈمی کے دفتر واقع لوئر مال جاتے ہیں اور اکیڈمی کے انتظامی اور اشاعتی معاملات کو خوش اسلوبی سے چلاتے ہیں۔

خواجہ صاحب ایک مجلسی انسان ہیں۔ اس عمر میں بھی دوستوں اور طلباء سے گھنٹوں باتیں کرتے ہیں۔ اورینٹل کالج لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کے بعد ان کا تیسرا ٹھکانہ الحمد پبلی کیشنز ہے جس کے مالک صفدر حسین ان کا عزت و احترام کرتے ہیں۔ الحمد کے دفتر میں بھی دوست ان کے منتظر رہتے ہیں اور دیر تک دلچسپی کے امور پر گفتگو چلتی رہتی ہے۔ یوں اگر ہم خواجہ محمد زکریا کی زندگی کی جانچ کرنا چاہیں تو بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ایک شاندار زندگی گزاری ہے اور اب بھی قابلِ رشک زندگی بسر کر رہے ہیں۔

حضر و سفر

انسان جہاں جہاں رہتا ہے وہاں کی آب و ہوا اُس کے کردار اور شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان جہاں جہاں کے سفر کرتا ہے جن قریوں میں گھومتا پھرتا ہے وہ بھی اُس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا کی زندگی پر غور کریں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انھیں مختلف النوع علاقوں میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا جس سے اُن کے مزاج اور شخصیت میں تنوع پیدا ہوا۔ خواجہ محمد زکریا کی رگوں میں کشمیری خون ہے۔ اُن کا خمیر امرت سر کی مردم خیز مٹی سے اٹھا ہے۔ 1947ء میں تقسیم ہندوستان سے پہلے امرت سر تہذیبی اعتبار سے بہت توانا شہر تھا۔ کشمیر سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی اکثریت گورداس پور کے راستے اسی شہر میں قیام کرتی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ شہر ادبی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ جلیانوالہ باغ کے واقعے نے اس شہر کو ہندوستان کی سیاست میں نمایاں حیثیت دی تھی۔ انجمن اسلامیہ امرت سر نے شہر میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو تعلیمی ادارے بنائے تھے۔ اُن میں ہندوستان بھر کے ترقی پسند اکٹھے ہو گئے صاحب زادہ محمود الظفر سے فیض احمد فیض تک اور

سیف الدین کچلو سے باری علیگ تک، بہت سے ترقی پسند فکر کے حامل مسلمان ادیب، دانشور اور سیاست دان اس شہر میں موجود تھے اور اس کی فضا کو جاندار بنا رہے تھے۔

خواجہ محمد زکریا نے 1940ء میں اسی شہر میں آنکھ کھولی اور تقسیم ہند کے بعد اگست 1947ء میں اپنے خاندان کے ساتھ لاہور ہجرت کی۔ لاہور میں اُن کا قیام بہت روز پر دہا مگر اس کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔ چند ماہ بعد اُن کا خاندان جھنگ شہر منتقل ہو گیا۔ جھنگ، دیہی فضا کا حامل شہر تھا مگر ادب و ثقافت میں اپنا رنگ اپنی خوشبو رکھتا تھا۔ خواجہ محمد زکریا نے میٹرک کا امتحان تک۔ اسی شہر سے پاس کیا۔ اسی شہر میں اُن پر تخلیق کی دیوی مہربان ہوئی اور انھوں نے اپنی ابتدائی غزلیں، نظمیں لکھیں۔ میٹرک کے بعد وہ لاہور آ گئے اور یہاں گورنمنٹ کالج لاہور میں اُن کے تعلیمی سفر کا آغاز ہوا۔ گورنمنٹ کالج بھی اپنی علمی و ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے جانا جاتا ہے۔ یہ پورے برصغیر میں جدید تصورات کی ترویج کے لیے جانا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج یونیورسٹی آف دی پنجاب سے تعلیم حاصل کی ان دونوں اداروں نے خواجہ صاحب کی شخصیت، اُن کی ترجیحات اور اُن کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اورینٹل کالج میں وہ شعر و شاعری سے تحقیق و تنقید کی طرف آئے اور پھر کم و بیش چالیس سال بعد جاپان کے قیام میں دوبارہ شاعری کی طرف راغب ہوئے۔

لاہور شہر میں ادبی سرگرمیوں کا مرکز تو یہی علاقہ تھا جس میں خواجہ محمد زکریا کے شب و روز گزرتے تھے یعنی گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج لاہور اس سے ذرا فاصلے پر پاک ٹی ہاؤس، چائنیز لنچ ہوم، وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی بلڈنگ اور دیگر مقامات تھے جہاں شہر بھر کے ادیب دانشور اور سیاسی کارکن اکٹھے ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب گاہے گاہے ان سب جگہوں پر آتے جاتے اور وہاں کے مباحث میں شریک ہوتے تھے۔ ادب اور زندگی کے بارے میں اُن کا ایک مخصوص نقطۂ نظر تھا اور وہ بڑی بے باکی سے اپنے تصورات کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اُن کے تصورات جامد نہیں رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن میں تبدیلی بھی آئے۔ وہ نہ تو کبھی اپنے تصورات میں آنے والی تبدیلی پر شرمندہ ہوئے نہ اسے چھپانے کی کوشش کی۔ اُن کے اندر وسعت قلبی اور نئی باتوں کو قبول کرنے کی صلاحیت میں اُن کے متنوع جگہوں پر قیام اور اُن کے مختلف ممالک کے اسفار نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ مختلف ممالک میں گھوم پھر کر اور مختلف لوگوں سے مل کر انھیں زندگی کی رنگارنگی کا احساس ہوا اور انھوں نے اس رنگارنگی کو دل سے قبول بھی کیا۔

پاکستان سے باہر وہ سب سے پہلے 1977ء میں بھارت گئے۔ پھر انھوں نے 2004ء اور 2006ء میں بھارت کا سفر کیا۔ بھارت ایک سطح پر تو بہت سے حوالوں سے ثقافتی سطح پر پاکستان کے قریب ہے۔ مشرقی پنجاب اور پاکستانی پنجاب کے درمیان نسلی، لسانی اور ثقافتی اشتراکات موجود ہے۔ اردو زبان بھارت میں بھی وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بھارت کا سفر خواجہ صاحب کے لیے ایک سطح پر تو اپنی جنم بھومی سرحد سرکی طرف مراجعت تھی مگر ہمیں اُن کے ہاں اس حوالے سے جذباتی پن دکھائی نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زمینی ہجرت کے ساتھ ساتھ ذہنی اور نفسیاتی ہجرت بھی کی اور پاکستان کو بطور وطن دل سے قبول کیا۔ اس حوالے سے ہمیں اُن کے ہاں کسی طرح کا تذبذب دکھائی نہیں دیتا۔

دوسرا ملک جہاں انھیں جانے کا موقع ملا۔ وہ متحدہ عرب امارات ہے جس کا سفر انھوں نے ستمبر 1984ء جون 2002ء اور پھر اپریل 2003ء میں کیا۔ اس سفر سے انھیں عرب خطے میں ابھرتی نئی عالمی سیاحتی جگہ کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ یہ خالصاً سیاحتی اسفار تھے اور انھوں نے اپنے اس سفر سے خوب لطف اٹھایا۔

امریکہ دنیا کا وہ سب سے اہم ملک ہے جہاں انھیں جانے اور جہاں کے حالات اور ثقافت کو دیکھنے کا انھیں بار بار موقع ملا۔ وہ پہلی بار جولائی 1993ء میں امریکہ تشریف لے گئے۔ امریکہ جانے کا مقصد سیر و سیاحت اور اپنے بچوں اور عزیز رشتے داروں سے ملاقات تھا۔ دوسری بار وہ مئی 1999ء میں تیسری بار جون 2002ء، پھر جون 2003ء، پھر اگست 2007ء، جولائی 2009ء، مئی 2013ء، جون 2016ء اور مئی 2018ء میں وہ آخری بار امریکہ گئے۔ امریکہ کی طرز زندگی وہاں کے لوگوں اور وہاں کے ثقافتی مظاہر کے بارے میں وہ مثبت رویہ رکھتے ہیں اور امریکی طرز زندگی کے بعض پہلوؤں کو پوری طرح سراہتے ہیں۔ جبکہ اگر کسی پہلو میں وہ خامی دیکھتے ہیں تو اس کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

چوتھا ملک جہاں وہ ایک سے زیادہ بار گئے انگلستان ہے۔ انگلستان کے سفر انھوں نے اگست 2007ء، مئی 2013ء، جون 2016ء اور مئی 2018ء میں کیے۔ ان اسفار کا بنیادی مقصد بھی اپنے بچوں، رشتے داروں سے ملنا اور سیر و سیاحت تھا۔ خواجہ محمد زکریا انگلستان کی تہذیبی زندگی سے بھی متاثر ہوتے اور وہاں کے لوگوں کی طرز زندگی کو پسند بھی کرتے ہیں۔

دنیا کے دو ملک ایسے ہی جہاں خواجہ محمد زکریا ملازمت کی غرض سے مقیم رہے۔ پہلے انھوں نے

ایک سال کے لیے 1993ء میں بیجنگ یونیورسٹی، چین میں بطور ماہر مضمون خدمات سرانجام دیں۔ چین میں وہ ثقافتی مغائرت محسوس کرتے رہے اور چین کے سرکاری حکام کے رویے سے بھی وہ زیادہ مطمئن نہیں۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ چینی وہ دنیا کی واحد قوم ہے جو تحریری معاہدے سے بھی مکر جاتی ہے اور معاہدے کی شرائط کی من مانی تشریح کرتی ہے۔

خواجہ محمد زکریا نے جاپان میں بھی بطور ماہر مضمون خدمات سرانجام دیں۔ وہ جائیکا کے پروگرام کے تحت جاپان گئے۔ جاپان میں اُن کا قیام 1995ء سے 1999ء تک رہا۔ جاپان میں انھوں نے مطمئن زندگی گزاری اور جاپانیوں کے طرزِ زندگی اور کام کرنے کے طریقے سے متاثر ہوئے۔ جاپان ہی میں اُن پر شاعری کی دیوی پھر سے مہربان ہوئی اور وہ اپنی لڑکپن کی محبت شاعری کی طرف پلٹے۔

خواجہ محمد زکریا نے حج کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب کا سفر بھی کیا۔ اپنے اس سفر کے دوران انھوں نے اپنے مذہبی فرائض بھی سرانجام دیے اور عربوں کی بود و باش اور طرزِ زندگی کا مشاہدہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے عمرہ کی ادائیگی کے لیے بھی سعودی عرب کا سفر اختیار کیا۔

علمی، ادبی اور انتظامی خدمات

خواجہ محمد زکریا تعلیم و تدریس سے وابستہ ہوئے اب ساٹھ سال مکمل ہونے والے ہیں۔ اس دوران انھوں نے بھرپور تدریسی زندگی گزاری ہے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اگر ہم مختصر انداز میں ان کی تدریسی زندگی کے بنیادی نکات کا خاکہ کھینچیں تو وہ کچھ یوں بنے گا۔

۱۔ لیکچرار	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۶۲ـ۶۳ء
۲۔ لیکچرار	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۶۳ـ۷۰ء
۳۔ اسسٹنٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۷۰ـ۷۷ء
۴۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۷۷ـ۷۹ء
۵۔ پروفیسر	ملتان یونیورسٹی، ملتان	یکم فروری ۱۹۷۹ء ۳۱ دسمبر ۱۹۷۹ء
سول سروسز اکادمی	دفتری اردو کی تدریس	۱۹۸۰ـ۸۱ء
۶۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۸۰ـ۸۳ء

۷۔ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور	۸۳۔۲۰۰۰ء
۸۔ ماہر مضمون	پیکنگ یونیورسٹی چین	فروری ۱۹۹۲ء
		۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء
۹۔ ماہر مضمون	جائیکا، جاپان	۱۹۹۵ تا ۱۹۹۹ء
۱۰۔ وزیٹنگ پروفیسر	ایچی سن کالج لاہور	۲۰۰۱ تا ۲۰۰۴ء
۱۱۔ وزیٹنگ پروفیسر	گورنمنٹ کالج لاہور	۲۰۰۳۔۴ء
۱۲۔ پروفیسر ایمریطس (اردو)	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۲۰۱۰ء (تا حیات)
۱۳۔ صدر شعبۂ اردو	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج	۱۹۸۴ تا ۱۹۹۲ء
۱۴۔ ڈین آف فیکلٹی	ملتان یونیورسٹی	۱۹۷۹ء
۱۵۔ ڈین آف فیکلٹی	پنجاب یونیورسٹی	۱۹۹۳ تا ۱۹۹۵ء
۱۶۔ پرنسپل	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۹۵ء۔۱۹۹۳ء
		۲۰۰۰ء۔۱۹۹۹ء
۱۷۔ ڈائریکٹر	شعبہ تاریخ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور	جولائی ۲۰۰۸ تا فروری ۲۰۱۰ء
۱۸۔ سیکرٹری	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی	۲۰۰۹ تا حال

کم و بیش ساٹھ سال کے طویل دورانیے میں اور مندرجہ بالا حیثیتوں سے کام کرنے کے باعث ان کے طلباء کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان کے بہت سے طلباء تو اب اپنی مدت پوری کر کے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اردو ادب کے علاوہ بھی شاید ہی کسی اور استاد کی خدمات اتنی زیادہ اور اتنی کثیر الجہات ہوں۔ خواجہ محمد زکریا نے نہ صرف اردو ادب کی تدریس میں اپنے طلباء کو پڑھایا بلکہ انھوں نے تحقیق کے میدان میں بے شمار طلباء کی ایم۔اے کی سطح کے مقالات لکھنے میں نگرانی اور ہدایات دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ 27 طلباء کو پی۔ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول میں بطور نگران رہنمائی فرمائی۔ ان میں انور محمود خالد، طاہر تونسوی، سعد اللہ کلیم، سعادت سعید، رشید امجد، سلیم آغا قزلباش، فخر الحق نوری، زاہد منیر عامر، یونس جاوید، احسان اکبر اور ضیاء الحسن جیسے اردو ادب کے اساتذہ شامل ہیں۔

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خواجہ محمد زکریا نے اردو ادب کی ترویج و ترقی میں کتنا حصہ ڈالا ہے۔ وہ اپنی ہر کلاس کے ہر طالب علم کے استاد رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی غیر رسمی مجالس بھی سیکھنے سکھانے کا اہم

ذریعہ ہیں۔ خود راقم کو ۲۰۱۹ء میں ان سے غیر رسمی انداز میں شاعری اور بالخصوص مجید امجد کی شاعری کی تفہیم کے لیے منعقد ہونے والی نشستوں میں سیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے جس طرح شاعری کے فنی رموز سمجھائے۔ مجید امجد کی شاعری کی تفہیم کے لیے اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا وہ انھی کا خاصہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی مندرجہ بالا تدریسی، علمی، ادبی اور انتظامی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے ۲۰۱۱ء میں انھیں تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا۔ بلاشبہ خواجہ محمد زکریا کا شمار ان افراد میں ہوتا جن کی بدولت اس اعزاز کی توقیر میں اضافہ ہوا۔

خواجہ محمد زکریا کی شخصیت

علم نفسیات میں شخصیت سے مراد انسان کے اوصاف کا وہ مجموعہ لیا جاتا ہے جو اسے ایک منفرد شناخت عطا کرتا ہے اور جس کے باعث انسان کے افعال اور کردار میں تسلسل اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں انسان کی ظاہری شخصیت اور باطنی اوصاف دونوں شامل ہیں۔

خواجہ محمد زکریا جاذبِ نظر شکل و صورت کے حامل ہیں۔ ان کا قد اور جسامت میانہ ہے۔ چہرہ بیضوی، چہرے کے نقوش دلکش اور آنکھیں بے حد روشن اور شفاف ہیں۔ دہانہ مختصر، ہونٹ پتلے، ناک متناسب، اور چہرے پر ہر وقت شرافت اور وجاہت جھلکتی ہے۔ بہت دلکش انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور دورانِ گفتگو مقابل کے مقام و مرتبے کا پورا خیال کرتے ہیں۔ اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتے ہیں اور اپنے سے چھوٹے افراد کے ساتھ شفقت و نرمی کا سلوک کرتے ہیں۔ کشمیری النسل ہونے کے باعث جلد کی رنگت سفید ہے اور اس پر وہ خوش رنگ اور خوش وضع لباس زیبِ تن کرتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا کے حوالے سے اردو کے جید ادیبوں نے اظہارِ خیال کر رکھا ہے۔ مثلاً اردو کے اہم فکشن نگار رحیم گل ان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ان کی شخصیت اس وقت نکھر کر سامنے آتی ہے جب وہ اسٹیج پر کسی ادبی موضوع پر گفتگو کر رہے ہوتے۔ اس وقت اس کا ذہنی قد اس کے جسمانی قد سے دس ہاتھ اونچا نظر آتا ہے۔" (۴۴)

اردو کے مایہ ناز شاعر امجد اسلام امجد ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے انھیں اچھا جوان چہرہ دیا ہے یہ خواجہ صاحب کی طبیعت کی نفاست ہے کیوں کہ جس شخص کا باطن صاف و پاکیزہ ہو اس کا اثر اس کے چہرے پر ضرور اثر ڈالتا ہے۔ (۴۵)

عشرت سلطانہ کو انٹرویو دیتے ہوئے خواجہ محمد زکریا کی زوجہ شگفتہ زکریا ان کے عادات و اطوار کے بارے میں کہتی ہیں:

"زکریا اپنے لباس کا انتخاب خود کرتے ہیں اور اچھا لباس پہنتے ہیں، میں بھی کبھار اپنی پسند کا کرتا شلوار لے آتی ہوں۔"

"زکریا کھانے پینے میں زیادہ پریشان نہیں کرتے کہ تازہ روٹی ضرور پکائیں۔ جو بھی میسر ہو آرام سے کھا لیتے ہیں، کچھ تعریف بھی نہیں کرتے کہ اچھا پکا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کچھ نہیں کہہ رہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔ برائی بھی نہیں کرتے، بعض اوقات میں پوچھوں کہ کیسا تھا؟ تو کہہ دیتے ہیں کہ اچھا تھا۔ نخرے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے روٹی پکانی نہیں آتی، اگر ملازم موجود نہ ہو جو روٹیاں پکاتا ہے تو ڈبل روٹی کھا کر گزارا کر لیتے ہیں۔"(۴۴)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا گفتگو بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ اس کی گواہی تو ان کے بہت سے احباب دیں گے یہاں صرف ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے درج کی جا رہی ہے۔

"ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا گھر ہمارے گھر (لاہور کینٹ) سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ ہفتہ دس روز میں ایک آدھ مرتبہ ضرور آتے ہیں اور پوری محفل پر چھا جاتے ہیں۔ لاہور کے تعلیمی ماحول کے بارے میں ان کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ ایسے ایسے حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شخصیات، ایک نئے تناظر میں دکھائی دینے لگتی ہیں، صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے ہر دل عزیز ہیں۔"(۴۷)

خواجہ محمد زکریا کی ایک اور بہت اہم خوبی ان کا نہایت تیز اور وسیع حافظہ ہے۔ انھیں بلاشبہ ہزاروں اشعار یاد ہیں۔ ان کے ہر معاصر نے اس بات کی گواہی دی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی تحریر کی ہے اور وہ ان دنوں اشاعت کے مراحل میں ہے اس کے مطالعہ سے اس بات کا بہت اچھی طرح احساس ہوتا ہے کہ انھیں اپنے ابتدائی بچپن کی باتیں تفصیل سے اب بھی یاد ہیں۔ ان کی یہ حیرت انگیز خوبی خداداد ہے اور اس کی بدولت نہ صرف انھیں اپنے تخلیقی وتنقیدی کام میں بہت سہولت ہوتی ہیں بلکہ بعض اوقات یار لوگ ان کی مروت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں لغت یا انسائیکلوپیڈیا کی طرح لیتے ہیں۔ اپنے بچپن کے ابتدائی ایام کی باتیں یاد کرتے ہوئے وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

"جنگ (جنگ عظیم دوم) کے ابتدائی دو تین برسوں میں والد کی آمدن بہت کم ہو گئی تھی۔ والد کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ بھی کثیر العیال کنبے کے لیے بہت تھوڑی تھی۔ لشٹم پشٹم گزارہ ہوتا تھا اور اس مفلوک الحالی کے اثرات بچوں تک بھی پہنچتے تھے کہ ان کا جیب خرچ بھی آٹے دال کے چکر کی نذر ہو جاتا تھا۔ والد بڑے کھلے دل کے تھے، جب پیسہ ان کے پاس آتا، خاصی بڑی تعداد میں پھل وغیرہ لے آتے۔ ہمیں

میلوں میں گھماتے اور حسب دل خواہ چیزیں خرید کر دیتے لیکن ایسے مواقع کم ہی آتے۔ والدہ سگھڑ تھیں اور اسی وجہ سے گھر کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا، جانی بیمار رہتی تھیں، میں نے پہلے تو انھیں لاٹھی لے کر آہستہ آہستہ چلتے دیکھا، پھر وہ اس سے بھی محروم ہو گئیں اور بستر پر پڑ گئیں۔ مناسب علاج کے لیے رقم نہیں تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھیں۔ (۴۸)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ انھوں نے بڑے تفصیل اور دیانتداری سے اپنی ابتدائی زندگی کی یادوں کو قلم بند کیا ہے۔ بعض لوگ جب شہرت اور نام حاصل کر لیتے ہیں تو وہ اپنے ماضی کے حالات کو چھپانے کے لیے طرح طرح کے افسانے گھڑتے ہیں اور اپنا ایک مصنوعی ماضی تخلیق کرتے ہیں جسے مشتاق احمد یوسفی نے اپنی ایک تحریر میں ماضی تمنائی کا نام دیا تھا۔

مگر جو لوگ اندر سے مضبوط ہوتے ہیں اور جو اپنے ماضی پر شرمندہ نہیں ہوتے وہ اپنے حالات کو حقیقی رنگ ہی میں بیان کرتے ہیں اور ایسا ہی خواجہ محمد زکریا نے کیا ہے وہ اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے اور اپنی غربت کی تصویر کھینچتے ہوئے ذرا نہیں شرمائے اور سب کچھ بلا کم و کاست ضبط تحریر میں لے آئے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا کے بچپن میں پنجاب کے شہروں اور دیہاتوں میں بعض کھیل بہت معروف تھے جو اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ انھیں اپنے بچپن میں پتنگ بازی کا بہت شوق تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے گولیاں (بنٹے) پنج گیٹ گنڈیریاں، ٹھیکریاں اور اخروٹ وغیرہ بھی کھیلے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"امرتسر میں پتنگ بازی کا بہت رواج تھا۔۔۔ رنگ رنگ کی ڈوریں بکتی تھیں ۔۔۔ میں بھی ڈوریں اور پتنگیں لوٹ کر خوب اڑایا کرتا تھا اور اس عمر میں پتنگ کو قابو میں رکھنے کے فن سے خوب آگاہ ہو چکا تھا۔"(۴۹)

پاکستان آنے کے بعد جھنگ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران پہلے فٹ بال کا شوق تھا اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ بعد میں وہ اتفاقاً کالج کی کرکٹ ٹیم میں شامل کر لیے گئے۔ انھیں اس کھیل میں بھی دلچسپی محسوس ہوئی اور اپنے مزاج میں شامل محنت اور لگن سے انھوں نے کرکٹ میں اپنا نام بنایا اور جنگل کالج کی کرکٹ ٹیم کی قیادت بھی کی۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ ایک بار ان کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ "امپائر" بنیں اور "ٹیسٹ امپائر" کے درجے تک پہنچیں مگر قدرت نے ان کے لیے شعر و ادب کا میدان منتخب کر رکھا تھا وہ اسی کے نہایت اہم اور نامور کھلاڑی اور

اسپاٹر ہے۔

خواجہ صاحب کے بچپن کا سب سے اہم واقعہ اگست 1947ء میں برصغیر کی دو ممالک پاکستان اور بھارت میں تقسیم تھی۔ اس واقعہ نے اس خطے کے کروڑوں لوگوں کی زندگیوں پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ تقسیم کے بعد فسادات اور ہجرت نے لاکھوں لوگوں کو بے گھر کیا اور نہایت ناساعد حالات میں نقل مکانی پر مجبور کیا۔ خواجہ محمد زکریا کا خاندان بھی نقل مکانی کرنے والوں میں شامل تھا۔ ان کے بہت سے عزیز و اقارب نے بھی امرتسر سے لاہور ہجرت کی۔ جب فسادات اور ہجرت کا یہ واقعہ پیش آیا تھا تو خواجہ محمد زکریا کی عمر تو برس تھی اور انھیں اس دور کی باتیں پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنے سوانح میں بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک بار ہماری موجودگی میں حملہ ہوا تو نوجوان ہمیں ہوتے میں اٹھا کر نسبتاً دور کے ایک سکول میں لے گئے۔ وہ تین لوگ پہرے پر بیٹھ گئے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ اگر حملہ آور اندر گھس آئے تو وہ سکول کو آگ لگا کر تمام عورتوں اور بچوں کو جلا کر راکھ کر دیں گے تا کہ ہم ان کے ہاتھ نہ آ جائیں۔ لیکن حملہ پسپا ہو گیا اور ہم محفوظ رہے۔" (۳۰)

مندرجہ بالا واقعہ تو امرتسر کا ہے۔ اس دور میں امرتسر سے لاہور کا سفر بھی جان جوکھوں کا سفر تھا۔ راستے میں قافلوں پر بلوائی حملہ آور ہوتے۔ نوجوانوں اور مردوں کو قتل کر دیتے، عورتوں کو اغوا کر کے لے جاتے۔ خواجہ صاحب بھی اگست 1947ء میں امرتسر سے بذریعہ ٹرین لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ اپنے سفر کا احوال وہ یوں رقم طراز کرتے ہیں۔

"درمیان میں بلوچ رجمنٹ کے چند فوجیوں کا دستہ تھا..... ہماری گاڑی پر بھی حملے کی کوشش کی گئی۔ فوجیوں کی جوابی گولیوں پر حملہ آور چند لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے اور گاڑی راستے میں رکے بغیر واہگہ پہنچ گئی۔ "پاکستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے گونجنے لگے۔ لوگ سجدے کرنے لگے۔" (۳۱)

خواجہ صاحب کی بہت اچھی یادداشت کا حوالہ ہمیں جابجا ان کے بزرگوں، اساتذہ، رفقائے کار اور طلباء کی باتوں میں ملتا ہے۔ انھیں اردو اور فارسی کے بے شمار اشعار یاد ہیں۔ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ تیسری یا چوتھی جماعت میں باقاعدہ وزن میں شعر یاد کرنے لگے تھے۔ ان کے ایک استاد ڈاکٹر ظہور الدین ان کی اچھی یادداشت اور شعر بازی آفرینی کی گواہی یوں دیتے ہیں:

"خواجہ زکریا کو بہت سارے اشعار یاد تھے، اگر کلاس میں پڑھتے پڑھتے کوئی مصرعہ بھول جاتا تو

ان سے کہتا کہ بتا ؤ کیا شعر ہے؟ وہ شعر کہتے بھی تھے، شعر شناس بھی تھے۔" (۳۲)

خواجہ محمد زکریا کی شخصیت کا ایک اہم پہلو نظم وضبط اور سلیقہ بھی ہے۔ ان کے روز مرہ کے معاملات میں ایک باقاعدگی ملتی ہے۔ آج کل وہ صبح سویرے اٹھتے ہیں۔ ناشتے کے وقت موسیقی سننا بھی ان کے معاملات کا حصہ ہے۔ ناشتے کے بعد اپنے پڑھنے کے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ تین چار گھنٹے پڑھنے لکھنے اور اپنی جاری منصوبوں پر کام کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتے ہیں۔ اس کے بعد اہل خانہ سے گپ شپ، شام کی چائے، رات کا کھانا اور کھانے کے بعد آدھ پون گھنٹہ سیر اور چہل قدمی، ان کے معاملات کا حصہ ہیں۔ وہ کھانے پینے میں کافی احتیاط کرتے ہیں۔ اسی لیے گزشتہ 25 سال سے ذیابیطس کے مریض ہونے کے باوجود خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔

جس دن انھیں تدریسی فرائض سر انجام دینے کے لیے اورینٹل کالج کے شعبہ اُردو میں آنا ہوتا وہ وقت پر کالج آتے ہیں۔ باقاعدگی سے اور مقررہ وقت پر اپنی کلاس پڑھاتے ہیں۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کلاس میں تاخیر سے آئیں یا جلد کلاس چھوڑ کر چلے جائیں۔ وہ نہ صرف خود نظم وضبط اور قاعدے قانون کی پابندی کرتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے طلبہ، رفقائے کار اور اپنے ملازمین سے بھی اس بات کی توقع کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ایک شاگرد جو بعد میں ان کے شعبہ اُردو میں رفیق بھی رہے ڈاکٹر فخر الحق نوری کا درج ذیل بیان بہت اہم ہے۔

"میں نے دیکھا ہے کہ وہ انتظامی معاملات میں قاعدے قانون کے پابند ہونے کے باوجود کسی کو نقصان پہنچانے یا پریشان کرنے کو قطعی طور پر پسند نہیں کرتے۔ کوئی ان کی خوشامد کر کے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اور کوئی ان سے دور رہ کر نقصان نہیں اٹھا سکتا۔ وہ زندگی کے معاملات اور ان معاملات کو چلانے کے لیے ضروری اقدامات کرنے کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔" (۳۳)

خواجہ محمد زکریا اخلاقی جرات کے مالک بھی ہیں۔ وہ علمی اور انتظامی معاملات میں اپنا ایک نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اسے صاف گوئی سے بیان کرتے ہیں۔ اپنے موقف سے کسی غرض یا لالچ کی وجہ سے دستبردار نہیں ہوتے البتہ اگر انھیں دلیل یا ثبوت سے قائل کیا جائے تو ہٹ دھرمی کا مظاہرہ بالکل نہیں کرتے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو فی زمانہ ہمارے معاشرے میں ناپید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں لاہور سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ کے ایک مضمون سے اقتباس ملاحظہ کریں:

"No one can make him shift his opinion by force illogically. A student Party, who has been infamous for using the academic staff as its puppet had to face defeat when it came face to face with Khawaja sahib.He was able to bring its leaders around that therein being stubborn and wrong doers was to be dealt with a strong policy based on justice. No party has ever been able to impress him by its muscle power or suppress him about getting their men into academic staff, at least in the departments under khawaja sahib - and very interestingly, there was a time when he was acting head of at least three departments simultaneously.

خواجہ محمد زکریا کے دو معتبر معاصرین کی گواہی یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر اور اصولی موقف کے لیے کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اگر ان کے سامنے کسی کی حق تلفی ہو تو اسے برداشت نہیں کرتے اور حق دار کو اس کا حق دلوانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ہمیں بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ لیکن یہاں میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا جب صدر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج لاہور میں تھے تو یہاں اردو کے نامور شاعر، نقاد اور استاد سجاد باقر رضوی بھی پڑھا رہے تھے۔ سجاد باقر رضوی بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر کام کر رہے تھے۔ ان کی ریٹائرمنٹ قریب تھی اور لگتا تھا کہ وہ بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ہی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ خواجہ صاحب نے کوشش کر کے فل پروفیسر کی پوسٹ کا اعلان کروایا۔ اورینٹل کالج اور جامعہ پنجاب میں بعض اصحاب یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ترقی ہو۔ اس پہ انھوں نے کوشش کی کہ انٹرویو نہ ہو اور سجاد باقر رضوی ریٹائر ہو جائیں۔ ایسا ہی ہوا مگر خواجہ محمد زکریا نے یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط کے مطابق انٹرویو کروایا۔ سجاد باقر رضوی فل پروفیسر منتخب ہوئے اور انھیں یہ عہدہ بعد از ریٹائرمنٹ ملا۔ یاد رہے کہ خواجہ محمد زکریا اور سجاد باقر رضوی بالکل ابتدا سے اورینٹل کالج، شعبۂ اردو میں موجود اساتذہ کے مختلف گروپوں سے تعلق رکھتے تھے اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں میں نظریاتی اور فکری اختلافات بھی موجود تھے۔ مگر اس سب کے باوجود چوں کہ خواجہ صاحب یہ سمجھتے تھے کہ سجاد باقر رضوی کا حق بنتا ہے کہ وہ فل پروفیسر بنیں اس لیے انھوں نے باقر صاحب کو ان کا حق دلوانے کے لیے تگ و دو اور جد و جہد کی۔ صرف اس ایک مثال سے خواجہ صاحب کی اصول پسندی اور راست بازی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

خواجہ محمد زکریا کی شخصیت میں ایک اہم وصف ان کی انا پسندی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اسے منفی وصف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دراصل ہر صاف گو اور اصول پسند آدمی انا پسند بھی ہوتا ہے۔ انا پسندی سے مراد یہ ہے کہ فرد یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کی انا کو ٹھیس پہنچائے یا اس کی تضحیک کرنے کی کوشش کرے، اسے بلا وجہ مذاق کا نشانہ بنائے یا کوئی اسے بلا اجازت اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے، اس حوالے سے دیکھا جائے تو ہمیں خواجہ محمد زکریا میں یہ وصف ایک مثبت شکل میں ملتا ہے۔ انا پسندی کے ساتھ ساتھ ان میں منکساری اور دوسروں کی مدد کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے۔ وہ اُردو ادب کے طلباء کی ہر طرح سے مدد کرتے رہتے ہیں ان کی بھی جو ان کے باقاعدہ طالب علم ہیں اور ان کی بھی جو کسی حوالے کے ساتھ یا بغیر کسی حوالے کے ان کے پاس آتے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا صاحب کے دیرینہ مرحوم دوست ڈاکٹر صدیق جاوید ان کے عہد جوانی کے معاملات اور دوستوں کے ساتھ وقت گزاری کی روداد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"خواجہ صاحب اورینٹل کالج میں استاد تھے اور میں طالب علم، ہم روزانہ پاک ٹی ہاؤس جاتے 9 بجے کے قریب سب لوگ منتشر ہونا شروع ہو جاتے تو میں اور خواجہ صاحب کا معمول تھا کہ مال روڈ سے الفلاح تک پیدل قدمی کرتے ہوئے آتے، پھر واپس ٹی ہاؤس جاتے۔ خواجہ زکریا سائیکل اٹھاتے اور سمن آباد اپنے گھر روانہ ہو جاتے اور میں ہوسٹل..... راستے میں ہم ادب اور ادبی مسائل پر گفتگو کرتے۔" (۳۵)

اسی طرح خواجہ محمد زکریا کے دیرینہ رفیق ڈاکٹر سید اکرم شاہ ان کی مجلس پسند طبیعت اور ان کے دوست نواز مزاج کے حوالے سے اپنا مشاہدہ اور تاثر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"ایک روز دیکھا کہ خواجہ صاحب شاپنگ لفافوں سے لدے پھندے چلے آرہے ہیں، یہاں آفس میں آئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ظہیرالدین، ان کے استاد کی سالگرہ ہے۔ انھوں نے اس کا اہتمام کیا ہے، پھر اورینٹل کالج کے باقی اساتذہ بھی آگئے اور اس طرح سالگرہ کا کیک کاٹا گیا۔" (۳۶)

خواجہ محمد زکریا اپنے اساتذہ کا احترام کرنے والے، دوستوں سے محبت کرنے والے طلباء کا خیال کرنے والے اور اپنے سے چھوٹوں پر شفقت کرنے والے انسان ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سراپا جمال ہیں ان کی طبیعت میں جلال بھی موجود ہے۔ مخالفوں کے سامنے ڈٹ جانا ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ غلط بات کی مخالفت بڑے جوش و جذبے سے کرتے ہیں۔ یوں بعض دفعہ موقع پرست

اور مفاد پرست لوگ ان کے مخالف بن جاتے ہیں۔ مگر وہ اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ یوں مجھے
گمان گزرتا ہے کہ ہمارے عہد میں جن اصحاب پر اقبال کا درج ذیل شعر صادق آتا ہے ان میں پروفیسر
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سرفہرست ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

خواجہ محمد زکریا کی شخصیت میں ایک اور غیر معمولی وصف یہ ہے کہ وہ اپنے معاصرین، اپنے سے
بعد میں آنے والے ادبا اور اپنے طلباء کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں بخل کی بجائے فراخ دلی سے
کام لیتے ہیں۔ یہ بات ان کے اعلیٰ ظرف ہونے کی دلیل ہے۔ اورینٹل کالج سے جاری ہونے والے
ایک مجلہ "شرق" کے چیئرمین کو انٹرویو دیتے ہوئے یوں اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہیں:

"جی ہاں آپ درست کہہ رہے ہیں کہ اکثر اساتذہ میرے شاگرد ہیں۔ اور تحسین اور فراقی
صاحب ایسے اساتذہ ہیں جنہوں نے مجھ سے باقاعدہ طور پر نہیں پڑھا البتہ اور تحسین صاحب نے
Ph.d میری نگرانی میں کی ہے۔ اس لیے انہیں میں شاگرد کہوں تو کوئی حرج نہیں۔ فراقی صاحب ایسے استاد
ہیں جو غیر معمولی خصوصیات کے حامل ہیں کئی جہتوں میں صاحب مطالعہ ہیں۔ عربی، فارسی اور انگریزی بہت
اچھی جانتے ہیں۔ میں اگر یہ کہوں کہ میں ان کا طالب علم ہوں تو کوئی غلط بات نہیں۔ ویسے بھی عالم آدمی ہیں
سینئر اساتذہ میں سہیل صاحب ہیں جب وہ طالب علم تھے میں ایک نوجوان استاد تھا۔ بعد میں مرغوب حسین
طاہر صاحب اور فخر الحق نوری صاحب ایسے استاد ہیں جن پر بہت اعتماد ہے۔ پہلے بھی یہ اپنے آپ کو ایک
اچھا استاد ثابت کر چکے ہیں اور آئندہ بھی اچھے استاد ثابت ہوں گے اور شعبہ ان پر فخر ہوگا۔ اور تحسین
صاحب، زاہد منیر صاحب اور کامران صاحب سے مجھے بہت ہی اچھی توقعات ہیں۔" (۳۷)

جس فراخ دلی اور مشاہدہ و نظری کا مظاہرہ خواجہ محمد زکریا نے کیا ہے اس کی مثالیں ہمارے عہد میں
خال خال نظر آتی ہیں۔

کوائف نامہ

شخصی کوائف

نام:	خواجہ محمد زکریا
تاریخ ولادت:	۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء (امرتسر)
ولدیت:	خواجہ غلام نبی
قومی شناختی کارڈ نمبر:	۳۵۲۰۱-۱۲۰۷۷۰۷-۹
مستقل پتا:	۲۱/۲۹۵ اے، مغل روڈ، لاہور چھاؤنی۔

تعلیمی کوائف

۱۔	بی اے آنرز (فارسی)	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۶۰ء
۲۔	ایم اے اردو (فرسٹ کلاس فرسٹ)	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۶۲ء
۳۔	ڈپلوما ہندی (فرسٹ کلاس فرسٹ)	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۷۳ء
۴۔	پی ایچ ڈی	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۷۴ء

تدریسی خدمات

۱۔	لیکچرار	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۶۲-۶۳ء
۲۔	لیکچرار	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۶۳-۷۰ء
۳۔	اسسٹنٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۷۰-۷۷ء
۴۔	ایسوسی ایٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۷۷-۷۹ء

۵۔ پروفیسر	ملتان یونیورسٹی، ملتان	یکم فروری ۱۹۷۹ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۷۹ء
۶۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۸۰ـ۸۳ء
۷۔ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	۱۹۸۳ـ۲۰۰۰ء
۸۔ ماہرِ مضمون	پیکنگ یونیورسٹی، بیجنگ	۱۹۹۲ء
۹۔ ماہرِ مضمون	جائیکا، جاپان	۱۹۹۵ تا ۱۹۹۹ء
۱۰۔ پروفیسر ایمریٹس (اُردو)	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۲۰۱۰ تا حال

انتظامی عہدے

۱۔ صدر شعبۂ اُردو	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	۱۹۸۳ تا ۱۹۹۲ء
۲۔ ڈین آف فیکلٹی	ملتان یونیورسٹی، ملتان	۱۹۷۹ء
۳۔ ڈین آف فیکلٹی	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۹۳ء۔۱۹۹۵ء
۴۔ پرنسپل	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	۱۹۹۵ء
۵۔ پرنسپل	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	۱۹۹۹ء۔۲۰۰۰ء
۶۔ ڈائریکٹر	شعبہ تاریخِ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور	جولائی ۲۰۰۹ء۔ فروری ۲۰۱۲ء
۷۔ وزیٹنگ پروفیسر	پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	۲۰۱۰ء۔ تا حال

پی ایچ ڈی کے مقالات کی نگرانی

پنجاب یونیورسٹی:

اُردو:

نمبر شمار	سند یافتہ کا نام	موضوع	ڈگری ملنے کا سال
۱۔	نصیر محمد انجم رحمانی	برطانوی دور میں اُردو کے فروغ میں پنجاب کے نظامِ تعلیم کا حصہ	۱۹۸۰ء

۲۔	نزہت کرام	ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ حیات اور علمی، ادبی کارنامے	۱۹۸۲ء
۳۔	انور محمود خالد	اُردو نثر میں سیرت رسول	۱۹۸۲ء
۴۔	حفیظ الرحمٰن (عابد تونسوی)	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱۹۸۳ء
۵۔	سعد اللہ کلیم	اُردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں	۱۹۸۳ء
۶۔	افتخار احمد (نیر صہبائی)	یوسف ظفر۔ حیات اور فن	۱۹۸۸ء
۷۔	سعادت حسن سعید	اُردو قصیدے کا تہذیبی اور فنی مطالعہ	۱۹۸۸ء
۸۔	اورنگ زیب عالمگیر	تدوین کلیات شعر تاج	۱۹۹۰ء
۹۔	اختر رشید امجد	میراجی۔ شخصیت اور فن	۱۹۹۳ء
۱۰۔	محمد عمر خان آرزو	عالمی کلاسیکی داستانوں اور اُردو داستانوں کا تقابلی مطالعہ	۱۹۹۴ء
۱۱۔	سلیم آغا قزلباش	جدید اُردو افسانے کے رجحانات	۱۹۹۴ء
۱۲۔	محمد عالم خان	اُردو افسانے میں رومانی رجحانات	۱۹۹۷ء
۱۳۔	فوزیہ چودھری	اُردو کی مزاحیہ صحافت	۱۹۹۷ء
۱۴۔	اختر پرویز	اُردو مسدس کا ارتقا	۱۹۹۷ء
۱۵۔	فخر الحق نوری	ن۔م۔ راشد	۱۹۹۷ء
۱۶۔	زاہد منیر عامر	تدوین کلیات میر سوز	۱۹۹۹ء
۱۷۔	ناصر عباس بلوچ	اُردو مقالات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	۲۰۰۰ء
۱۸۔	یونس جاوید	حلقہ ارباب ذوق تنظیم۔ تحریک۔ نظریہ	۲۰۰۱ء
۱۹۔	ریاض قدیر	ایم ڈی تاثیر شخصیت اور ادبی کارنامے	۲۰۰۳ء
۲۰۔	محمد اعظم (اختر شمار)	جلال الدین حیدر دہلوی	۲۰۰۳ء
۲۱۔	ضیاء الحسن	اُردو تنقید کا عمرانی دبستان	۲۰۰۳ء
۲۲۔	احسان اکبر	اُردو ادب کا پاکستانی مزاج	۲۰۰۵ء

پنجابی:

۲۳۔	محمد اسلم رانا	جوش افضل الدین	۱۹۸۳ء
۲۴۔	عصمت اللہ زاہد	نوشہ گنج بخش قادری	۱۹۸۸ء
۲۵۔	ثریا احمد	سید شاہ ہاشم۔ اوہناں دا اردو تے شاعری	۱۹۹۰ء

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان:

۲۶۔	انور احمد	اردو افسانا اپنے سیاسی اور سماجی تناظر میں	۱۹۸۰ء
۲۷۔	اے۔ بی۔ اشرف	اردو ڈراما اور حکیم احمد شجاع	۱۹۸۰ء

کتابیں

۱۔ قدیم نظمیں ..... بک ورلڈ، لاہور، ۱۹۶۳ء

۲۔ قدیم اصناف شعر ..... لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء

۳۔ نئے پرانے خیالات ..... ایضاً، ۱۹۶۸ء

۴۔ شاعری کی کتابیں ..... نیشنل بک کونسل پاکستان، لاہور، ۱۹۷۲ء

۵۔ پریم چند کے بہترین افسانے (انتخاب مع مقدمہ) ..... میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۷ء

۶۔ اردو میں قطعہ نگاری ..... غیب بک ڈپو، لاہور، ۱۹۷۷ء

۷۔ اقبال کا ادبی مقام ..... مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء

۸۔ اکبر الٰہ آبادی۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ..... مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۰ء

۹۔ ان گنت سورج (انتخاب کلام مجید امجد) ..... پولیمر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۰ء

۱۰۔ انتخاب مقالات اقبال (بین الاقوامی صد سالہ اقبال کانگرس کے مقالات کا انتخاب) با اشتراک پروفیسر محمد منور ..... پنجاب یونیورسٹی، شعبہ اقبالیات، لاہور، ۱۹۸۲ء

۱۱۔ کلیات مجید امجد (زمانی ترتیب) ..... ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء۔ (بعد ازاں چند ایڈیشن الحمد پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیے)

۱۲۔ شعری ادب (بی اے اردو کی نصابی کتاب) ..... پاپولر پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۳۔ شرح بانگ درا (با اشتراک ڈاکٹر شفیق احمد) ..... ایضاً، ۱۹۸۸ء

۴۔	شبلی کی فارسی شاعری	فارسی ادب جلد سوم
۵۔	گرامی کی فارسی شاعری	فارسی ادب جلد سوم

پنجاب یونیورسٹی کی اُردو دائرہ معارف اسلامیہ میں شامل مضامین:

۱۔ حفیظ جالندھری۔ حیات اور ادبی خدمات

پنجاب یونیورسٹی کی اُردو دائرہ معارف اقبال میں شامل مضامین:

۱۔	اقبال اور اشتراکیت	جلد اول
۲۔	اقبال کے شارحین	جلد دوم
۳۔	اقبال اور داغ	جلد دوم
۴۔	اقبال کی اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربات	جلد سوم
۵۔	اقبال کی فارسی شاعری میں ہیئت کے تجربات	//

مطبوعہ مقالات / مضامین:

۱۔	اکبر الہ آبادی کی غزل	ماہنامہ "نیرنگ خیال" لاہور	نومبر ۱۹۶۲ء
۲۔	جوش کی نظم نگاری	ماہنامہ "ساقی" کراچی (جوش نمبر)	۱۹۶۳ء
۳۔	دلی کا دبستان شاعری	مجلہ "راوی" گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۶۳ء
۴۔	مقدمہ "زادِ راہ"	مکتبہ میری لائبریری، لاہور	۱۹۶۳ء
۵۔	مقدمہ "میدانِ عمل"	ایضاً	۱۹۶۳ء
۶۔	اُردو شاعری میں خواتین کا حصہ	ماہنامہ "حرم" لاہور	اکتوبر ۱۹۶۸ء
۷۔	ڈاکٹر محمد صادق کی "تاریخ ادب اُردو" (انگریزی) کا تجزیہ	ماہنامہ "کتاب" لاہور	۱۹۶۷ء
۸۔	اقبال کا فلسفہ خودی (محمد عثمان) کا جائزہ	ایضاً	۱۹۶۷ء
۹۔	اقبال اور فسطائیت	مجلہ "اندازے" لاہور	۱۹۶۸ء

۱۰۔	قدیم اردو شاعری۔ آغاز تا ۱۸۵۷ء	ماہنامہ "تخلیق" لاہور	جولائی ۱۹۶۷ء
۱۱۔	حالی اور شیفتہ	مجلہ "کریسنٹ" اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور (حالی نمبر)	۱۹۶۹ء
۱۲۔	سید عابد علی عابد کی تصنیفات و تالیفات	ماہنامہ "تخلیق" لاہور	۱۹۷۱ء
۱۳۔	عابد علی عابد کا ناولٹ "شمع"	//	ایضاً
۱۴۔	مجید امجد کی شاعری (بحوالہ شب رفتہ)	ایضاً	نومبر ۱۹۷۲ء
۱۵۔	اکبر اور اقبال	مجلہ "راوی" گورنمنٹ کالج لاہور	۱۹۷۳ء
۱۶۔	مجید امجد۔ کچھ یادیں کچھ باتیں	"نقد" پشاور (مجید امجد نمبر)	۱۹۷۴ء
۱۷۔	مجید امجد کی نظم "[illegible]" کا تجزیہ	ایضاً	
۱۸۔	رسالہ "نقد" کے مجید امجد نمبر کا جائزہ	سہ ماہی "فنون" لاہور	۱۹۷۴ء
۱۹۔	مجید امجد۔ وفات پر تاثرات	سہ ماہی "اوراق" لاہور	۱۹۷۶ء
۲۰۔	خاک نشیں (میرزا ادیب) کا مطالعہ	مجلہ "نقوش" لاہور	۱۹۷۶ء
۲۱۔	حفیظ جالندھری کی غزل	سہ ماہی "صحیفہ" لاہور	جنوری ۱۹۷۶ء
۲۲۔	پرتھی راج راسا (مقالات حافظ محمود شیرانی) کا جائزہ	ایضاً	مئی ۱۹۷۶ء
۲۳۔	حفیظ جالندھری کی شاعری اور یہ سرزمین	مشمولہ کتاب "ابوالاثر میرا شوہر" (مرتبہ بیگم خورشید حفیظ)، لاہور	۱۹۷۷ء
۲۴۔	مقالات حافظ محمود شیرانی کا جائزہ	سہ ماہی "صحیفہ" لاہور	۱۹۷۷ء
۲۵۔	اقبال اور قاآنی	"یادنامہ اقبال" ایران کلچرل سنٹر لاہور	۱۹۷۷ء
۲۶۔	اکبر الہ آبادی سے منسوب ایک جعلی کتاب (گنج پنہاں)	ماہنامہ "کتاب" لاہور	۱۹۷۷ء

۲۷۔	اقبال کے شارحین	ایضاً (اقبال نمبر)	نومبر ۱۹۷۷ء
۲۸۔	اقبال معاصرین کی نظر میں (ڈاکٹر عبداللہ قریشی)	سہ ماہی "صحیفہ" لاہور	نومبر ۱۹۷۷ء
۲۹۔	علاؤ الدین کلیم (شخصی خاکہ)	مجلہ "معاصر" لاہور	۱۹۸۰ء
۳۰۔	مجید امجد کا تصور کائنات	ماہنامہ "ماہ نو" لاہور	مئی ۱۹۸۱ء
۳۱۔	سید عبدالحمید عدم	ماہنامہ "ماہ نو" لاہور	مئی ۱۹۸۱ء
۳۲۔	سید جعفر طاہر (شخصی خاکہ)	مجلہ "تخلیقی ادب" کراچی	۱۹۸۲ء
۳۳۔	حافظ محمود شیرانی اور محمود طرز	"ماہ نو" لاہور	ستمبر ۱۹۸۲ء
۳۴۔	عدم کے شعری مجموعے	مشمولہ کتاب "عدم شخصیت اور شاعری" (مرتبہ اسرار زیدی)، لاہور	۱۹۸۲ء
۳۵۔	"عیی" از محمد طفیل	مجلہ "نقوش" لاہور	ستمبر ۱۹۸۲ء
۳۶۔	اکبر الٰہ آبادی اور ہمارا قومی تشخص	ماہنامہ "ماہ نو" لاہور	اگست ۱۹۸۳ء
۳۷۔	قاضی فضل حق کی ایک نصابی کتاب	مجلہ "راوی" گورنمنٹ کالج، لاہور	۱۹۸۳ء
۳۸۔	مولانا ظفر علی خاں کے دو غیر مطبوعہ خطوط	مجلہ "چناب" ڈگری کالج، وزیر آباد "ظفر علی خاں نمبر"	۱۹۸۳ء
۳۹۔	غالب شعور اور لاشعور کا شاعر	ماہنامہ "ماہ نو" لاہور	فروری ۱۹۸۵ء
۴۰۔	ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ادبی خدمات	مجلہ "سیارہ" لاہور	۱۹۸۶ء
۴۱۔	نقوش کا غزل نمبر	مجلہ "نقوش" لاہور	۱۹۸۷ء
۴۲۔	شیر افضل جعفری	ماہنامہ "شام و سحر" لاہور	۱۹۸۸ء
۴۳۔	طنز و مزاح کا مجدد۔ شکیل ہوشیار پوری	ماہنامہ "محفل" لاہور	۱۹۸۸ء
۴۴۔	قافیہ	مجلہ "مشرق" اورینٹل کالج، لاہور	۱۹۸۹ء
۴۵۔	ممتاز مفتی کی تحریریں	سہ ماہی "القلم" جھنگ	اکتوبر ۱۹۸۹ء
۴۶۔	جھنگ کا قلندر	پاکستانی ادب، اسلام آباد	۱۹۹۰ء

نمبر	عنوان	رسالہ	تاریخ
۴۷۔	فصاحت جنگ جلیس	سالنامہ "نقوش" لاہور	۹۳۔۱۹۹۱ء
۴۸۔	مجید امجد اور جدید نظم	مجلّہ "دستاویز" راولپنڈی	۱۹۹۳ء
۴۹۔	جدید اُردو نظم اور فیض	ماہنامہ "علامت" لاہور	اگست ۱۹۹۳ء
۵۰۔	جام مہتاب (عقیل ہوشیارپوری)	ماہنامہ "محفل" لاہور	مئی ۱۹۹۳ء
۵۱۔	مجید امجد کی شاعری	مجلّہ "النظم" جھنگ (مجید امجد نمبر)	۱۹۹۳ء
۵۲۔	مجید امجد ۔ ایک مطالعہ	مجلّہ "راوی" گورنمنٹ کالج، لاہور	۱۹۹۵ء
۵۳۔	کلام اقبال میں خود احتسابی کی تلقین	سہ ماہی "اقبال" لاہور	جنوری ۱۹۹۵ء
۵۴۔	جمیل جالبی سے ایک مکالمہ	ماہنامہ "ادب دوست" لاہور	جون ۱۹۹۵ء
۵۵۔	اقبال کی رجائیت	سہ ماہی "اقبال" لاہور	جنوری ۱۹۹۵ء
۵۶۔	امجد اسلام امجد کی تنقید (نئے پرانے)	ماہنامہ "ادب دوست" لاہور	جنوری ۱۹۹۵ء
۵۷۔	اُردو نظم ۔ تعارف و انتخاب (۱)	ایضاً	فروری ۱۹۹۵ء
۵۸۔	ایضاً (۲)	ایضاً	مارچ ۱۹۹۵ء
۵۹۔	ایضاً (۳)	ایضاً	اپریل ۱۹۹۵ء
۶۰۔	علاءالدین کلیم ۔ تعارف و انتخاب	ماہنامہ "ادب دوست" لاہور	ستمبر ۱۹۹۵ء
۶۱۔	سجاد باقر رضوی کی یاد میں	ایضاً	جنوری ۱۹۹۶ء
۶۲۔	پاکستان میں اُردو تنقید (۱)	ایضاً	اگست ۱۹۹۷ء
۶۳۔	ایضاً (۲)	ایضاً	ستمبر ۱۹۹۷ء
۶۴۔	اُردو نظم کے پچاس سال	مجلّہ "سیارہ" لاہور	۱۹۹۷ء
۶۵۔	بالِ جبریل کی ایک اور شرح کی ضرورت	سہ ماہی "اقبال" لاہور	اکتوبر ۱۹۹۹ء
۶۶۔	اکبر الٰہ آبادی کی رباعیات اور تضمینیں	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نصاب ایم اے (اُردو) کی کورس بک (یونٹ ۱۴)	۱۹۹۹ء

۶۷۔ حالی کی نظمیں	ایضاً	۱۹۹۹ء
۶۸۔ خاطرات۔ ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی	ادب دوست لاہور	مئی ۲۰۰۰ء
۶۹۔ فکرِ اقبال کی تسہیل	سہ ماہی "اقبال" لاہور	جولائی ۲۰۰۰ء
۷۰۔ ن۔ م راشد کا شعری فکری ارتقا	مجلّہ "راوی" گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۰ء
۷۱۔ دیوارِ چین کے اس پار (ارشاد احمد عارف)	در کتاب: انداز پذیرائی کے (مرتب: مظفر علی راجا) تحریکِ علم و ادب لاہور	۲۰۰۰ء
۷۲۔ شکیل شفائی کی وفات پر	مجلّہ "راوی" گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۱ء
۷۳۔ اورینٹل کالج میں میرا زمانہ طالب علمی	مجلّہ "شرق" اورینٹل کالج لاہور	۲۰۰۱ء
۷۴۔ پہلی بارش اور ناصر کاظمی	مجلّہ "خیال" فیصل آباد	۲۰۰۱ء
۷۵۔ اشفاق احمد کا جو دل کھیل تماشا	مجلّہ "راوی" گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۲ء
۷۶۔ جدید اُردو شاعری (نظم جاتی)	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (ایم فل کورس بک یونٹ: ۸)	۲۰۰۲ء
۷۷۔ تدریسِ غزل	در کتاب "تدریسِ ادب" علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد	۲۰۰۳ء
۷۸۔ تاریخِ ادبِ اُردو (ڈاکٹر محمد صادق)	در کتاب "[illegible] مضامین" مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور	۲۰۰۳ء
۷۹۔ پاکستان میں جدید اُردو نظم	ماہنامہ "جناحت" ہریانہ (بھارت)	۲۰۰۳ء
۸۰۔ اقبال کی فارسی شاعری	ماہنامہ "ادبِ دوست" لاہور	نومبر ۲۰۰۳ء
۸۱۔ ایوب صابر ایک اقبال دوست محقق و نقاد	اخبارِ اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	
۸۲۔ علامہ اقبال کی فارسی نظم اُردو نثر کے قالب میں	ماہنامہ "ادبِ دوست" لاہور	فروری ۲۰۰۴ء
۸۳۔ دورِ حاضر کا داستان گو۔ اشفاق احمد	مجلّہ "کرن" لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی لاہور	۲۰۰۴ء

نمبر	عنوان	مطبوعہ	تاریخ
۸۴۔	حمید کوثر کی شاعری	ماہنامہ "شام و سحر" لاہور	اکتوبر ۲۰۰۵ء
۸۵۔	نعیم ضیاء الدین کے افسانے	مجلہ "مخزن" ۱۷، بریڈ فورڈ انگلینڈ	۲۰۰۵ء
۸۶۔	مشفق خواجہ۔ لاجواب محقق	"معاصر" انٹرنیشنل، لاہور	جنوری ۲۰۰۵ء
۸۷۔	حالی جاودانیاں	ماہنامہ "ادب دوست" لاہور	دسمبر ۲۰۰۵ء
۸۸۔	کچھ غالب کے بارے میں	در کتاب "سالانہ انتخاب" لاہور آرٹس فورم، لاہور	۰۶-۲۰۰۵ء
۸۹۔	طاہر سعید ہارون دوہے کا نقاد و شاعر	در کتاب "طاہر سعید ہارون کی دوہا نگاری" (مرتبہ مناظر عاشق ہرگانوی)، نرالی دنیا، دہلی	۲۰۰۶ء
۹۰۔	حمید احمد خاں۔ ایک کثیر الجہت شخصیت	ماہنامہ "الحمرا" لاہور	مارچ ۲۰۰۶ء
۹۱۔	حمید احمد خاں کی ایک تازہ تصنیف	ایضاً	اپریل ۲۰۰۶ء
۹۲۔	۱۹۴۷ء کے بعد اردو نظم	مجلہ "سیارہ" لاہور (شمارہ ۵۳)	۲۰۰۶ء
۹۳۔	علامہ اقبال کی چند فارسی نظموں کا اردو روپ	ماہنامہ "ادب دوست" لاہور	مارچ ۲۰۰۶ء
۹۴۔	شاد عارفی۔ ایک تعارف	ایضاً	مئی ۲۰۰۶ء
۹۵۔	وحید الہ آبادی۔ ایک تعارف	ایضاً	جون ۲۰۰۶ء
۹۶۔	علامہ اقبال اور ہمارے مسائل (۱)	ایضاً	نومبر ۲۰۰۶ء
۹۷۔	ایضاً (۲)	ماہنامہ "ادب دوست" لاہور	جنوری ۲۰۰۷ء
۹۸۔	مرزا ہادی رسوا کی شاعری	ایضاً	فروری ۲۰۰۶ء
۹۹۔	مشفق خواجہ۔ خوش طبع انسان	سہ ماہی "الزبیر" بہاولپور (شمارہ ۱،۲)	۲۰۰۶ء
۱۰۰۔	حمید احمد خاں۔ ایک معتبر غالب شناس	مجلہ "حریم ادب" کہروڑ پکا	اگست ۲۰۰۷ء

مجید امجد شاعر حیات و کائنات	(۲۰۱۳ء) مجلہ بازیافت شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور
مظفر علی ظفر ایک بھولا بسرا شاعر	(ستمبر ۲۰۱۵ء) ماہنامہ تخلیق لاہور
جسٹس جاوید اقبال	(جنوری ۲۰۱۶ء) الحمرا لاہور
مولانا حالیؔ ادبی خدمات	(جون ۲۰۱۶ء) بازیافت شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی
وزیر آغا ایک منفرد شاعر	(اکتوبر ۲۰۱۸ء) سہ ماہی استعارہ لاہور
مکتوبِ غالب کے بارے میں	(ستمبر ۲۰۲۰ء) تخلیق لاہور
بچھڑ گئے۔ سانحہ مشرقی پاکستان پر ایک کتاب	(ستمبر ۲۰۲۰ء) ماہنامہ الحمرا لاہور

انعامات

۱۔ پنجاب یونیورسٹی گولڈ میڈل (۱۹۶۳ء)

۲۔ بابائے اردو گولڈ میڈل (انجمن ترقی اردو کراچی) ۱۹۶۳ء

۳۔ ڈاکٹر [illegible] ایوارڈ برائے تحقیق (۱۹۷۹ء)

۴۔ صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی (۲۰۱۱ء)

۲۵۔ امجد اسلام امجد، عشرت سلطانہ سے امجد اسلام کا مکالمہ۔ ۹ جنوری ۲۰۱۰ء

۲۶۔ شگفتہ زکریا، ڈاکٹر عشرت سلطانہ سے گفتگو، ۳۰ مئی ۲۰۱۰ء

۲۷۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: "شاعری کا منظر نامہ" "انتخاب" سنگ میل لاہور ۲۰۰۹ء، (ص: ۳۲۹)

۲۸۔ محمد زکریا، خواجہ۔ "آپ بیتی"، زیرِ طبع

۲۹۔ ایضاً

۳۰ ایضاً

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ عشرت سلطانہ، ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب سے ذاتی گفتگو، (ص: ۱۹)

۳۳۔ عشرت سلطانہ، ڈاکٹر نور الحق نوری سے ذاتی گفتگو (زیر طبع مقالہ)، (ص: ۱۷)

۳۴۔ "The Frontier Post" November 09,1996

۳۵۔ عشرت سلطانہ، ڈاکٹر صدیق جاوید سے ذاتی گفتگو (زیر طبع ایم فل مقالہ)، (ص ۹)

۳۶۔ عشرت سلطانہ، ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ سے ذاتی گفتگو، (ص: ۲۰)

۳۷۔ محمد عمران، ادریس صادق، سیاحت قمر، کچھ یادیں کچھ باتیں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا سے ملاقات، مجلہ "شرق" اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب ۱۹۹۰ء، (ص: ۱۷۷)

باب دوم

خواجہ محمد زکریا کی تحقیق

خواجہ محمد زکریا کی شخصیت میں بہت سے ایسے عناصر ہیں جو انھیں ممتاز محققین کی صف اوّل میں کھڑا کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب مضبوط قوت ارادی کے مالک ہیں۔ سخت محنت کرتے ہیں، ان میں تلاش و جستجو کا مادہ بھی ہے اور چیزوں کا باریک بینی سے جائزہ لینے اور بال کی کھال اتارنے کی روش بھی ہے اور یہ سب اوصاف ایک بہت اچھے محقق کی نشانیاں ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز بطور شاعر کیا اور ان کے اچھے شاعر ہونے کی گواہی اس دور کے مشہور شاعر احسان دانش نے اپنی آپ بیتی میں دی۔ مگر ان کے اورینٹل کالج کے قیام کے دوران ان کا رجحان زیادہ سے زیادہ علمی اور تحقیقی معاملات کی طرف ہوتا چلا گیا۔ اس میں ان کے اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور اثرات بھی تھے۔ اس کالج کی فضا میں تحقیق اور علمی معاملات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ انھیں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور دیگر صاحبان علم کی قربت حاصل تھی۔ ان تمام اسباب کے باعث ان کی زیادہ توجہ علمی و تحقیقی معاملات میں بڑھتی چلی گئی۔

تحقیقی معاملات میں ان کی دلچسپی کا سب سے پہلا اظہار ان کے ایم۔ اے کے تحقیقی مقالہ "اردو میں قطعہ نگاری" سے ہوا۔ یہ مقالہ 1961ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچا اور غالب امکان اس بات کا ہے کہ یہ صنف اردو قطعہ پر پہلی بھرپور تحقیقی کاوش تھی جسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ خواجہ محمد زکریا کی یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کی تمہید میں خواجہ محمد زکریا صنف قطعہ کے حوالے سے بہت بامعنی بات کرتے ہیں۔

"قطعہ ایک ایسی صنف ہے جس کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ ابتداء میں اس کے موضوعات محدود تھے مگر اب اس میں ہر طرح کے مضامین شامل ہیں۔ اس کے لیے خاص طور پر مضامین کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً غزل کی زبان اور طرح کی ہے۔ قصیدے کی اور طرح کی۔ مگر قطعے میں دونوں طرح کی زبانیں استعمال کی جا سکتی ہیں اور استعمال کی جا رہی ہیں۔ اس لیے قطعے کی خارجی ہیئت کے

مطابق اس کے تمام تحریرات و موضوعات کا جائزہ لینا بہتر ہوگا۔ میں نے یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔(۱)

"اُردو میں قطعہ نگاری" کی اشاعت اول پر اگرچہ سن اشاعت درج نہیں ہے لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب 77-1976ء میں شائع ہوئی۔ اس کی جانب ایک اشارہ تو کتاب کا انتساب کرتا ہے جو کچھ یوں ہے۔

"اس عہد ناپرساں کے سب سے بڑے شاعر

مجید امجد

کی یاد میں، جو اپنے تمام فنی کمالات کے باوجود

یہ کہنے پر مجبور ہوا

"میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے

میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا"

مجید امجد کا انتقال 11 مئی 1974ء میں ہوا۔ اس لیے یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ اس کی پہلی اشاعت مئی 1974ء کے بعد کی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اپنے مقالے اور پھر کتاب کی اشاعت کے حوالے سے خود وضاحت کرتے ہیں "تمہید" میں ہی لکھا ہے کہ:

"یہ مقالہ میں نے ایم اے (اُردو) کے امتحان کے لیے لکھا تھا۔ بیرونی ممتحن نے اسے بہت پسند کیا۔ بعد ازاں کئی مرتبہ میں نے سوچا کہ اس کی طباعت کا بندوبست کیا جائے مگر ہر مرتبہ یہ سوچ کر ملتوی کرتا رہا کہ اس پر مکمل نظرثانی کر کے چھپنے کے لیے دوں گا مگر اس کا وقت نہ مل سکا۔ اب اس کو سرسری نظر سے دیکھ کر اور معمولی رد و بدل کر کے دنیائے ادب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ گزشتہ برسوں میں بھی صنفِ قطعہ پر تفصیل سے کچھ نہیں لکھا گیا اس لیے اس کی اہمیت برقرار ہے۔ توقع ہے کہ اس صنف کے اولین تفصیلی جائزے کی حیثیت سے یہ کوشش ناکام نہیں سمجھی جائے گی۔"(۲)

اسی "تمہید" سے ایک غلط فہمی کا آغاز بھی ہوتا ہے کہ اس میں صفحہ ب پر رقم ہے کہ "تحقیق کی ابتداء میں نے مئی 1971ء میں کی تھی اور اپریل 1976 میں اسے مکمل کیا۔"(۳) جبکہ اس صفحہ کے آخر پر دسمبر 1961ء اور خواجہ محمد زکریا، اورینٹل کالج لاہور درج ہے جو مقالے کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے۔ تحقیق کے آغاز اور تکمیل کے حوالے سے درج سنین سہو کاتب ہیں۔

"قطعہ نگاری کا آغاز" باب اول میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اس اہم ادبی صنف کے آغاز، اس کی تعریف، اس کے خد و خال اور اس کے دیگر اصناف سے فرق واضح کیا ہے جس سے صنف قطعہ کے فنی اور موضوعاتی خد و خال واضح ہو جاتے ہیں، اس باب میں خود کو صرف اُردو قطعہ نگاری تک محدود نہیں رکھتے بلکہ فارسی قطعہ نگاری پر بھی اجمالی نگاہ ڈالتے ہیں تاکہ اس اہم ادبی صنف کے تاریخی سفر سے قاری کو آگاہ کیا جا سکے۔

"اُردو شاعری میں قطعہ نگاری" باب دوم دکنی دور سے شروع کر کے شمالی ہند کی قطعہ نگاری تک آتا ہے اور یہ صنف قطعہ کے تاریخی ارتقا کو بیان کرتے ہیں۔ باب سوم "شمالی ہند میں قطعہ نگاری کا ارتقا" قدرے تفصیلی ہے اور اس میں دہلی، لکھنؤ اور دیگر اہم تہذیبی مراکز میں صنف قطعہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں انھوں نے میر تقی میر، مرزا سودا، حاتم، خواجہ میر درد، قائم، میر حسن، مصحفی، انشا، رنگین، نظیر، ذوق، غالب، شیفتہ، داغ، امیر مینائی وغیرہ کی قطعہ نگاری پر بات کی گئی ہے۔ اس باب میں ہمیں اس ریزہ کاری کا سراغ ملتا ہے جو محقق نے قطعات کی تلاش میں کی ہے کیوں کہ متعدد بالا شعرا میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایک دو قطعات ہی تخلیق کیے ہیں۔

چوتھا باب "دورِ جدید" میں خواجہ محمد زکریا نے بالکل درست نشاندہی کی ہے کہ اُردو میں قطعہ نگاری کے دورِ جدید کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے۔ خواجہ محمد زکریا اس دور کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد حالی کی قطعہ نگاری کی تنوع اور خوبصورتی کو سراہتے ہیں۔ حالی نے جس طرح اپنے قطعات میں عاشقانہ، صوفیانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی معاملات کو بیان کیا ہے اس کی بھی تعریف کرتے ہیں۔ اس باب میں حالی کے بعد اسماعیل میرٹھی، شبلی نعمانی، شاد عظیم آبادی، احسن مارہروی، ثاقب لکھنوی، نظم طباطبائی، عزیز لکھنوی، اکبر الہ آبادی، وحید الدین سلیم، غلام بھیک نیرنگ، خوشی محمد ناظر، سرور جہاں آبادی، سورج نرائن مہر اور علامہ محمد اقبال کی قطعہ نگاری پر بات کرتے ہیں۔ جہاں جہاں وہ شعرا کے قطعات درج کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ فنی اور فکری حوالے سے بہترین تخلیقات کو حوالے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ اپنی اس تحقیق کے دوران انھوں نے کیسے کیسے شعرا کے کلام کو تلاش کیا ہے اور اس میں دانش کے موتی بکھیرے ہیں۔

زیرِ نظر تحقیقی کتاب کا باب چہارم "دورِ جدید" سب سے زیادہ طویل ہے اور یہ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کی نصف اول کے قطعہ نگار شاعروں کے کام کا احاطہ کرتا ہے۔ اس دور میں وہ حالی، اکبر اور اقبال کو سب سے اہم قطعہ نگار قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعد میں آنے والے

شعرا نے زیادہ تر ان سے اثرات قبول کیے ہیں۔ مابعد اقبال دور کے شاعروں میں وہ مولانا ظفر علی خان، سیماب اکبرآبادی، حامد علی افسر، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، اثر صہبائی کی قطعہ نگاری پر خاص طور پر بات کرتے ہیں اور یہ حوالہ بھی دیتے ہیں کہ عبدالمجید سالک، آنند نرائن ملا، ساغر نظامی، ماہر القادری اور ہری چند اختر وغیرہ نے بھی تھوڑے تھوڑے قطعات تخلیق کیے ہیں۔

اس کے بعد وہ " اختر انصاری، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، فیض، مجاز، ساغر اور عبدالحمید عدم کی قطعہ نگاری کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ خواجہ محمد زکریا نہ صرف کسی شاعر کی قطعہ نگاری پر بات کرتے ہیں بلکہ اس کی شعری خصوصیات، منفرد انداز، فنی معاملات، مختلف شعرا کا موازنہ اور شاعروں کے ایک دوسرے پر اثرات کی نشاندہی بھی کرتے جاتے ہیں۔ ایسا صرف وہی محقق اور نقاد کر سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع ہو، ذوق شعری اعلیٰ ہو اور جس میں شعر کو پرکھنے کی خداداد صلاحیت موجود ہو۔

کتاب کا باب پنجم " نامور قطعہ نگار شعرا " حالی، اکبر اور اقبال کی قطعہ نگاری کے خصوصی مطالعے کے لیے مخصوص ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی قطعہ نگاری کا جائزہ لینے کے بعد وہ رقم طراز ہیں۔

" مجموعی طور پر حالی نے قطعات کو بیان حقیقت کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان پر اخلاق و پند کا رنگ غالب ہے۔ جس کی وجہ سے بیشتر قطعات خشک واقعیت کی روداد ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ ان کے اصلاحی مقصد کی وجہ سے ہے۔" (۴)

اسی طرح وہ اکبر الٰہ آبادی کی قطعہ نگاری پر تفصیلی بات کرتے ہوئے اپنے خیالات کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

" مجموعی طور پر اکبر کے قطعات اردو شاعری میں کیا بلحاظ موضوع اور کیا بلحاظ ہیئت بہت اہم اضافہ ہیں۔ اور اپنے دور میں اردو کے بہترین قطعات ہیں۔ تعداد اور معیار دونوں صورتوں میں حالی کے قطعات ان کے مقابلے میں نہیں لائے جا سکتے۔ حالی کے قطعات میں اعتدال اور متانت ہے تو ان میں ظرافت اور بذلہ سنجی ہے۔ اردو قطعات میں اس کثرت سے طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے اس سے پہلے مفقود تھے۔ اکبر نے اس کمی کو بہت اچھی طرح پورا کر دیا۔ تصویری کیفیت ان قطعات کا خاص وصف ہے۔ اثر پیدا کرنے کے لیے جتنے متنوع طریقے انھوں نے استعمال کیے حالی ان سے نا آشنا تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکبر کا میدان شاعری حالی سے زیادہ وسیع تھا اور مضامین حالی سے زیادہ دلچسپ تھے۔ اکبر نے قطعات لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی مسلسل نظمیں لکھنے کے لیے صنف قطعہ بہت اہم ہے۔" (۵)

آپ نے مندرجہ بالا اقتباس میں ملاحظہ کیا کہ انھوں نے کس خوبی سے نہ صرف اکبر کی قطعہ نگاری کی خصوصیات بیان کی ہیں بلکہ حالی کے ساتھ ان کا موازنہ کر کے دونوں شاعروں کے امتیازات بھی واضح کر دیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اکبر نے اُردو قطعہ نگاری میں کیا اضافہ کیا۔ اس کی جانب بھی اشارہ کر دیا ہے۔ اکبرالہ آبادی کے بعد انھوں نے علامہ محمد اقبال کی قطعہ نگاری کا جائزہ لیا ہے اور اقبال کے ظریفانہ قطعات پر اکبر کے اثرات کی وضاحت کرتے ہوئے صفحہ 129 پر حاشیے میں اس بات کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ اقبال نے قطعات اکبر کے رنگ میں لکھے تھے وہ ایک کتابچے "اکبری اقبال" مطبوعہ مرغوب ایجنسی لاہور سے شائع ہوئے تھے اور اس کتابچے کا دیباچہ خواجہ حسن نظامی کا تحریر کردہ تھا۔

علامہ محمد اقبال کی اُردو شاعری کی پہلی کتاب "بانگ درا" تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں کوئی قطعہ شامل نہیں۔ دوسرے حصے میں دو معمولی نوعیت کے قطعات ہیں۔ البتہ تیسرے دور میں کافی قطعات ہیں۔ اسی طرح ان کے دوسرے شعری مجموعے "بال جبریل" اور تیسرے اُردو شعری مجموعہ "ضرب کلیم" میں بھی قطعات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اپنی زیرِ نظر کتاب کے اس حصے کو الگ مضمون "اقبال کی قطعہ نگاری" کے طور پر بھی تحریر کیا ہے۔ وہ اقبال کے قطعات کے فنی اور فکری تجزیے کے بعد مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں۔

"غرض اقبال کے قطعات تعداد کے لحاظ سے ہر اُردو اور فارسی شاعر سے زیادہ ہیں، معیار بھی بہت بلند ہے۔ طویل اور مختصر قطعات میں انھوں نے بعض تجربات بھی خوب کیے ہیں۔ رباعی نما قطعات کو بھی انھوں نے ایک خاص مقام دیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قطعات میں کہیں غیر ضروری تفصیل کا شکار نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اشعار کی تعداد عموماً اس سے کم ہی رہتی ہے۔ مضمون بھی بڑے متنوع ہیں اور سوائے عشقیہ مضامین کے تقریباً ہر وہ مضمون اس میں آ گیا ہے جو آج تک ہمارے قطعات میں شامل رہا ہے۔ فلسفیانہ سوچ بچار کا اضافہ البتہ اقبال کا اپنا ہے۔ عشقیہ مضامین کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انھوں نے مادی اور جسمانی عشق کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا البتہ عشق مقاصد پر قطعات لکھے ہیں۔ ان خصوصیات کی بنا کر اقبال کو اُردو کے بہترین قطعہ نگاروں میں اہم مقام حاصل ہے۔"(۶)

کتاب کا باب ششم "قطعہ نگاری کے رجحانات" میں خواجہ محمد زکریا نے اُردو قطعہ نگاری کے عمومی رجحانات پر بات کرتے ہوئے، اُردو قطعہ کے تاریخی ارتقاء پر بات کی ہے اور ان مختلف رجحانات کی نشاندہی کی ہے جو اُردو قطعہ نگاری میں نمایاں رہے ہیں۔

اکبر الہ آبادی ہماری تہذیبی اور شعری زندگی کا نہایت اہم استعارہ ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہمارے ہاں تین فکری اور سیاسی رویے تھے۔ پہلا سرسید کا رویہ جو تقلید مغرب اور انگریز سرکار کے ساتھ تعاون کرنے کا تھا۔ دوسرا رویہ ہمارے مذہبی علماء کا تھا جو انگریز سے بالکل قطع تعلق کر کے اپنے ماضی میں ڈوب جانا چاہتے تھے۔ ان کے بین بین تیسرا رویہ یہ تھا کہ اب چوں کہ انگریز اس ملک پر حاکم ہے اس لیے اس سے مکمل قطع تعلق تو ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارا اپنا ایک ملی تشخص ہے اس لیے انگریزوں کی مکمل تقلید بھی ممکن نہیں۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو اپنے ملی تشخص کو بچاتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ چلا جائے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی راستے کا انتخاب کیا۔

اگر ہم انیسویں صدی کی آخری ربع صدی اور بیسویں صدی کی پہلی ربع صدی کے پچاس برسوں کو نظر میں رکھیں اور ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں اکبر الہ آبادی کا رویہ کافی حد تک معقول اور مصلحت پسندی پر مبنی دکھائی دیتا ہے۔ اکبر 1845ء میں پیدا ہوئے اور سترہ سال کی عمر میں 1862ء سے انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ 1859ء میں انھیں چودہ سال کی عمر میں انگریز مجسٹریٹ کے ذریعہ ملازمت ملی۔ یعنی 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے دو سال بعد وہ انگریز کی ملازمت میں آئے اور اس کے پانچ سال بعد شاعری شروع کی۔ اس دور میں جب ہر طرف جبر اور تشدد عام تھا۔ شک کی بنیاد پر لوگ جان سے جا رہے تھے۔ کھل کر انگریزوں کے خلاف لکھنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ ظاہر ہے اکبر نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ انھوں نے زندہ رہنے اور اپنی زندگی کو بامعنی بنانے کا انتخاب کیا۔ طنز و مزاح کے ذریعے وہ پیغام اپنی شاعری کے ذریعے دیا جسے وہ بہتر سمجھتے تھے۔

خواجہ محمد زکریا نے جب "اکبر الہ آبادی" کو اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے بطور عنوان چنا تو اس کی وجہ اکبر الہ آبادی کی شاعری، ہماری تہذیبی زندگی میں اکبر کی اہمیت اور اکبر الہ آبادی کے ساتھ ان کے ذہنی اور فکری اشتراکات تھے۔ اس مقالے کے نگران ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار تھے اور اس پر 1974ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ پہلی بار یہ کتابی صورت میں مجلس ترقی ادب، لاہور سے 1980ء میں شائع ہوا۔ دوسری تیسری اور چوتھی اشاعت سنگ میل لاہور کی طرف سے ہوئی اور اب پانچویں اشاعت 2021ء میں الحمد پبلی کیشنز لاہور کی طرف سے منظر عام پر آئی ہے۔

"اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" چھ ابواب اور پانچ ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔ باب اول

"حالات زندگی" میں خواجہ محمد زکریا نے بڑی عرق ریزی اور چھان بین کے بعد اکبر الہ آبادی کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی حالات کا تعین کیا ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب اکبر کے حالات زندگی کے بارے میں سب اچھا ہے کی رپورٹ نہیں دیتے بلکہ وہ بڑی دیانتداری سے حیات اکبری کی گوشہ کشائی کرتے ہیں۔ جیسے اکبر کی شادیاں، اکبر کا طوائفوں کے پاس کوٹھے پر جانا وغیرہ۔ اسی طرح ایک سے زیادہ شادیوں کی وجہ سے گھریلو ناچاقی اور پہلی بیوی کی اولاد کے ساتھ کشیدہ تعلقات کا بیان بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یوں بطور محقق خواجہ محمد زکریا زیر نظر موضوع سے کسی بھی طرح کی جذباتی وابستگی رکھنے کی بجائے، معروضی انداز میں اپنے موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی زندگی پر 28 صفحات کا یہ باب تحقیق کا شاندار نمونہ ہے۔

مقالہ کا باب دوم "سیاسی و سماجی پس منظر" میں اکبر الہ آبادی کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا نہایت اختصار مگر جامعیت سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں مغلیہ سلطنت کا زوال، یورپی اقوام کی آمد، انگریزی سلطنت کا قیام، ناکام جنگ آزادی کے نتائج، مغربی تعلیم کا آغاز، سرسید تحریک، مسلم لیگ کا قیام، تحریک خلافت، پین اسلامزم، ترک موالات، جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا۔ یہاں خواجہ محمد زکریا نے بہت سے مقامی اور انگریزی ماخذات سے استفادہ کیا ہے اور اس ماحول کو بہت خوبی سے واضح کیا ہے جس میں اکبر الہ آبادی پیدا ہوئے اور شاعری کی۔

کتاب کا تیسرا باب "اکبر کے افکار" فکر اکبری کی تفہیم کرتا ہے اور اس میں خواجہ محمد زکریا سب سے پہلے "اکبر پر اعتراضات" کی وضاحت کرتے ہیں اور اکبر کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

"افسوس یہ ہے کہ بہت سے نقاد اکبر کے افکار کی بلندی، گہرائی اور وسعت سے آگاہ نہیں ہیں اور ان کو تنگ نظر، رجعت پسند، تضادات کا شکار، سطحی نگاہ رکھنے والا اور خدا جانے کیا کیا کچھ سمجھتے ہیں۔" (۷)

اس کے بعد خواجہ محمد زکریا مختلف محققین اور ناقدین جیسے رام بابو سکسینہ، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، شیخ محمد اکرام، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر محمد صادق کی آرا کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اکبر کے خلاف لکھی جانے والی تنقید میں سے یہ چند نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کی رو سے اکبر ماضی کے اندھے مقلد، مغرب کے بے بصر نقاد، سائنس اور جدید ترقیات کے دشمن، مغرب کی لائی ہوئی برکات کے مخالف، گہرے شعور سے عاری، ہندوستان کی ترقی پذیر قوتوں کے نکتہ چین اور زمانے کی رو کے خلاف چلنے والے تھے۔ یہ الزامات بڑے سنگین ہیں۔ ان میں سے بعض باتیں تو صریحاً غلط الزام

تراش کی ذیل میں آتی ہیں اور بعض نیم صداقتوں کے ضمن میں شمار کی جاسکتی ہیں اور کون نہیں جانتا کہ نیم صداقت دروغ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"(۸)

خواجہ محمد زکریا اس کے بعد اکبر پر لگائے جانے والے الزامات کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال سے ان کا موازانہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں اکبر کئی موضوعات میں اقبال کا پیش رو ہے۔ اس نے اقبال سے پہلے ان موضوعات پر قلم اٹھایا اور اقبال سے زیادہ مطعون ہوا۔ وہ بالکل درست فرماتے ہیں کہ اکبر بنیادی طور پر شاعر ہے۔ اس لیے اس کی فکر کو بھی شاعرانہ جمالیات کے حوالے سے پرکھنا چاہیے خود خواجہ محمد زکریا اکبر کے بنیادی تصورات کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"افکار اکبر کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں، پہلا حصہ منفی ہے اور دوسرا حصہ مثبت۔ منفی حصہ وہ ہے جس میں انھوں نے تیزی سے رائج ہوتے ہوئے بعض رجحانات کو ہدف تنقید بنایا ہے اور مثبت حصہ وہ ہے جہاں انھوں نے بعض مٹتی ہوئی اقدار کے احیا کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ ان کے ہاں صرف تخریب کا جذبہ ہے تعمیر کا نہیں۔"(۹)

خواجہ محمد زکریا نے اکبر کے منفی اور مثبت افکار دونوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے ہندوستان سے پہلے کمپنی بہادر اور پھر تاج برطانیہ کی چیرہ دستیوں اور بداعمالیوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اگر کوئی قاری ہندوستان میں انگریزوں کا اصل چہرہ دیکھنا چاہے تو اس کے لیے زیر نظر کتاب کا تیسرا باب "اکبر کے افکار" بہترین دستاویز ہے۔ یہاں بات دلائل اور مصدقہ حوالہ جات سے کی گئی ہے بیشتر جگہوں پر حوالے بھی انگریز مصنفین ہی کے دیے گئے ہیں۔ یوں یہ باب نہ صرف اکبر الہ آبادی بلکہ انیسویں صدی کے ہندوستان کی تفہیم کے لیے بھی نہایت اہم ہے۔

خواجہ محمد زکریا نے مقالے کے چوتھے باب "شاعری کے اسالیب" میں اکبر الہ آبادی کی فنی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری کا بنیادی اسلوب طنز و مزاح کا ہے۔ اکبر کے عہد میں "اودھ پنچ" نے طنز و مزاح کا ایک اسلوب اُردو زبان میں رائج کیا تھا۔ اکبر کے طنزیہ اسلوب کو اختیار کرنے میں اس رسالے کا کردار بھی ہے۔ ایک اعتبار سے اکبر الہ آبادی اُردو زبان کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو اپنی شاعری میں شعوری طور پر اختیار کیا ہے۔ وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اکبر ایک اعلیٰ مقصد کے لیے شاعری کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مقصد چاہے کتنا بھی اعلیٰ کیوں نہ ہو شاعر کے مرتبے کا تعین شاعرانہ اسالیب اور جمالیاتی معیارات ہی سے ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی کے شاعرانہ اسالیب کی وضاحت کرتے ہوئے خواجہ محمد زکریا تفصیل سے اکبر کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اکبر نے اپنی شاعری میں متعدد اسالیب اور ہیئتی سانچے جیسے غزل، مثنوی، قطعہ، رباعی وغیرہ کو خوبی سے استعمال کیا ہے۔ جب ہم اکبر کے اسالیب کی طرف آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اکبر شاعری میں سب سے زیادہ طنز کا استعمال کرتے ہیں۔ اکبر نے بعض روایتی شاعرانہ سانچوں میں رد و بدل کیا ہے اور بعض مقامات پر تو یہ تبدیلی اتنی زیادہ ہے کہ پرانی شکل پہچانی نہیں جاتی۔ کہیں کہیں اکبر نے نئے تخلیقی تجربے بھی کیے ہیں۔ اس شاعری پر بحث کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''اکبر کی انفرادیت کا باعث زیادہ تر ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سمجھی جاتی ہے۔''(۱۰)

یہاں بھی خواجہ محمد زکریا مسلمہ رائج الوقت سے اختلاف کرتے ہیں اور موصوف عبدالماجد دریا آبادی کے ہم آواز ہو کر کہتے ہیں کہ اکبر میں ظریفانہ شاعری بہت کم اور طنزیہ شاعری بہت زیادہ ہے۔ خواجہ محمد زکریا اس غلط مبحث کو بھی سامنے لاتے ہیں کہ طنز و مزاح ''توام اصطلاحیں'' ہیں اور ان دو اصطلاحات کے درمیان فرق کی بخوبی وضاحت کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ طنز کے مختلف حربوں کو واضح کرتے ہوئے اکبر کے کلام میں طنز اور مزاح کے مختلف نمونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے درج ذیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

''کلیات اکبر کے چاروں حصوں میں تلاش کے بعد بھی چند اشعار مل سکے ہیں جنھیں ظرافت کی مد میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ تلاش بسیار کے بعد ممکن ہے چند اور اشعار بھی دستیاب ہو جائیں مگر اتنے زیادہ اشعار میں سے معدودے چند اشعار کو بہ مشکل ڈھونڈ نکالنا ہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اکبر ظریف نہیں طناز ہیں۔''(۱۱)

خواجہ محمد زکریا شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اس لیے وہ کلام اکبر سے بہت عمدہ مثالیں تلاش کرتے اور اپنے دلائل کے حق میں پیش کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اکبر کے اشعار میں تلخی کی مثالیں بے شمار مل جاتی ہیں اس میں خوش طبعی بہت کم ملتی ہے۔ اکبر ابتدا میں تلخی، غیظ اور غضب کا اظہار کرتے ہیں مگر جب دل خواہ نتیجہ نہیں نکلتا تو وہ شدید مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انھیں اپنے چاروں طرف تباہی و بربادی دکھائی دیتی ہے۔ شہر ویرانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ یہاں شہر آشوب میں ڈھلنے لگتی ہے۔ یہاں وہ کلام اکبر سے شہر آشوب کی مثالیں دینے کے بعد اکبر کے آشوب کا اس سے قبل کے آشوب گو شعرا حاتم، سودا، میر اور نظیر سے کرتے ہیں۔

شہر آشوب کی صنف کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اکبر اپنی شاعری میں طنز کی اہم قسم تعریض کو

استعمال کرتا ہے۔ تعریض طنز کا مہذب اور باعمل حربہ ہے۔ اس میں یہ صفت موجود ہے کہ جتانے کے
ساتھ ساتھ غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہے۔ دوسروں کی بجائے اپنی ذات کو طنز کا نشانہ بنانا دیگر احباب
کے لیے طنز کے تیر قابلِ برداشت بنا دیتا ہے کیوں کہ تعریض میں طنز کرنے والا خود کو نشانہ بناتا ہے لیکن
اصل میں جس پر طنز کرنا مطلوب ہوتا ہے وہ بھی اس کی چبھن محسوس کرتا ہے۔ خواجہ محمد زکریا اکبر کے ہاں
تعریض کے استعمال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"تعریض کے لیے اکبر نے زیادہ تر انگریزوں کو منتخب کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ
مغربی سامراج کے جبر و تشدد کے باعث ان پر کھلی کھلی چوٹیں کر نہیں سکتے تھے۔ تعریض کا دوسرا شکار وہ
دیسی افراد بنتے ہیں جو تہذیب وضع ترک کر کے اپنے ہی ملک میں اجنبی بن چکے ہیں۔ ان پر اکبر نے پھبتیاں
زیادہ کسی ہیں مگر انھیں تعریض کا نشانہ بھی بنایا ہے۔"(۱۲)

اکبرالہ آبادی نے تعریض کے ساتھ ساتھ طنز، ہجو، پھبتی، تمسخر، تقلیل مزاح یا دوٹ، بذلہ سنجی، لفظی
تکرار، لفظی الٹ پھیر، واقعاتی مزاح، تحریف، تضاد اور تقابل سے مزاح پیدا کرنا، مکالمے، افراد کے
لہجے سے مزاح پیدا کرنا، وغیرہ کو بھی بڑی خوبی سے طنز نگاری کے لیے استعمال کیا ہے اور طنز و مزاح
نگاری کا شاید ہی کوئی حربہ ہو جس کی چند مثالیں ہمیں اکبر کی شاعری سے دستیاب نہ ہو سکیں۔

اکبرالہ آبادی صرف طنز و مزاح نگار ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں دیگر شاعرانہ کمالات بھی خوب پائے
جاتے ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر لفظی رعایتیں، علامتیں اور امیجری کو بہت خوبصورتی سے اپنی شاعری
میں استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا لسانی پس منظر بھی کافی وسیع ہے، اُردو کے ساتھ ساتھ عربی،
فارسی، ہندی اور انگریزی کے الفاظ بڑی فراخ دلی سے اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں۔ قافیہ اور ردیف
بہترین اُردو شاعری خاص طور پر اُردو کی غزلیہ شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ اکبرالہ آبادی کے ہاں آپ کو
قوافی کے استعمال میں بڑی مہارت دکھائی دیتی ہے اور یہ اس حقیقت کی عکاسی ہے کہ وہ زبان، الفاظ و معانی
اور لغت کے مختلف لہجوں سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کے چوتھے باب "شاعری کے
اسالیب" میں خواجہ محمد زکریا نے اکبر کی شاعری کی ان فنی خصوصیات کو بڑی خوبی اور مہارت سے نمایاں کیا ہے
اور اکبر کے کلام سے نہایت اعلیٰ درجے کے نمونے اپنی بات کے ثبوت میں پیش کیے ہیں جو فی زمانہ کم یاب
تنقیدی وصف ہے۔ خواجہ محمد زکریا اکبر کی شاعری پر بات کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غرض اکبرالہ آبادی سنجیدہ بات کہتے ہیں مگر ان کا اسلوب مزاحیہ ہے اور مزاحیہ اسلوب کے جملہ

خصائص ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا ذخیرہ الفاظ وسیع اور کئی زبانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ضرورت کے مطابق وہ عربی، فارسی، ہندی یا انگریزی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں اور اس معاملے میں وہ اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ کسی لفظ کو غریب یا مبتذل نہیں سمجھتے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ شعری تخصیص فضا ہر لفظ کے استعمال کا جواز مہیا کر سکتی ہے۔ ایک وسیع اور ہمہ گیر ذخیرہ الفاظ پر تصرف نظیر کے بعد اکبر الہ آبادی کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔"(۱۳)

"اکبر الہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کا پانچواں باب "اصناف سخن" ہے۔ اس میں ان شعری اصناف پر بات کی گئی ہے جنھیں اکبر نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ یہاں خواجہ محمد زکریا نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اکبر نے جس صنف کو زیادہ استعمال کیا ہے۔ اس پر پہلے بات کی جائے۔ سب سے پہلے وہ غزل پر بات کرتے ہیں اور اکبر کی غزل کا جائزہ تاریخی تسلسل میں لیتے ہیں۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ابتداء میں اکبر الہ آبادی وحید الدین وحید سے اصلاح لیتے رہے اور اکبر اس بات کا فخریہ اظہار کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کے بقول وحید کا بیشتر کلام غیر مطبوعہ رہا پھر بھی انھوں نے علی حسنین زیبا کے مرتب کردہ انتخاب وحید کو تلاش کر کے وحید کی شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ اس کے کلام کے نمونے بھی درج کیے ہیں۔ ہمارے عہد میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے تاثر دوکون کرتا ہے۔

خواجہ محمد زکریا اکبر الہ آبادی کی غزل کا فنی اور فکری جائزہ لیتے ہوئے جہاں ضرورت محسوس کرتے ہیں دیگر نقادوں کی آراء سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے پروفیسر حمید احمد خاں، عبدالقادر سروری اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی آراء سے بحث کر کے اکبر کی غزل کے بنیادی خد و خال یوں نمایاں کیے ہیں:

"ان کے ہاں تہذیبی معاشرتی اور سیاسی مضامین غزل کا حصہ بن گئے ہیں۔ اسلوب میں اکبر نے اور بھی زیادہ تبدیلی کی ہے۔ ایسے الفاظ جنھیں غزل گو تغزل کے منافی سمجھتے تھے، بکثرت استعمال کیے ہیں۔ نئی علامتیں وضع کی ہیں۔ خاص کردار تراشے ہیں۔ بالکل نئی امیجری استعمال کی ہے۔ جو دنیائے غزل میں تازہ وارد ہے۔ مگر اس کے باوجود انھیں غزل کا مجتہد نہیں سمجھا جاتا تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اکبر کی غزل اس قدر منقلب ہو گئی ہے کہ نقاد اسے غزل نہیں نظم سمجھتے ہیں مگر یہ اکبر کی غزل سے انصاف نہیں ہے۔ ان کی غزل میں اس صنف کی بہت سی خصوصیات اب بھی برقرار ہیں۔"(۱۴)

اکبر کے ہاں قطعات بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں رباعی نما قطعات بھی ہیں اور کلاسیکی

انداز کے متعدد اشعار دے قطعات بھی۔ دونوں قسموں کے قطعات میں اعلیٰ درجے کی شاعری خاص بڑی تعداد میں مل جاتی ہے۔ ان میں سے بعض قطعات اپنے ربط کلام، قصہ در تسلسل اور بیان واقعات کے لیے بہت مقبول ہوئے ہیں۔ البتہ تاریخی قطعات کوئی خاص ادبی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ (۱۵)

اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں مختلف النوع اصناف کا استعمال کیا ہے ان میں سے غزل اور قطعہ کی بات ہو چکی ہے، اس کے علاوہ رباعی، مثنوی، مسمط، مخمس اور مسدس کو اکبر نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ خواجہ محمد زکریا کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ ہر صنف کے مختصر فنی اور تاریخی جائزے کے بعد اکبر کی شاعری میں اس صنف کے نمونے، اور جملہ اصناف صنف کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ "اصناف سخن" کا فنی اور فکری جائزہ لیتے ہیں اور اکبر الہ آبادی کی شاعری میں اس کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی درست اور مناسب طریقہ کار ہے جس کی مدد سے کسی شاعر کی فنی اور فکری حیثیت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں ہیئت کے تجربات بھی کیے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا چوں کہ اُردو شاعری کے رموز سے اچھی طرح آگاہ ہیں، قدیم شعری اصناف پر دسترس رکھتے ہیں اور کلاسیکی اُردو شاعری کا بہت عمدہ مطالعہ اور اس کا فہم رکھتے ہیں اس لیے وہ اکبر کی شاعری میں کیے گئے ہیئتوں کے تجربات کو جلد سمجھ لیتے ہیں اور ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے اُردو میں ڈرامائی نظم کا آغاز کیا اور اس کی ایک مثال "کرزن سبھا" ہے۔ اسی طرح اکبر نے اپنی شاعری کے کلیات جلد اول میں دو رباعیاں اس طرح تخلیق کی ہیں کہ وہ ایک دوسری کا جواب بن گئی ہیں۔ مختلف رباعیوں میں تعلق پیدا کر کے انھیں مربوط کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ دو رباعیوں کو ملا کر ایک نظم بھی بنا دی ہے۔ اکبر نے مکالماتی نظم کا تجربہ بھی کیا ہے۔ طویل نظم کا تجربہ "گاندھی نامہ" کے عنوان سے کیا۔ یہ نظم وفات اکبر کے بعد 1948ء میں شائع ہوئی اس میں گاندھی کی شخصیت کو مرکز بنا کر بیسویں صدی کی ابتدائی دو تین دہائیوں میں ہندوستان میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات پر بات کی گئی ہے۔ اکبر نے نظم غیر مقفیٰ بھی تخلیق کی ہیں۔ خواجہ محمد زکریا بڑی صاف گوئی سے بتا دیتے ہیں کہ یہ تجربہ تو اکبر نے ضرور کیا ہے مگر وہ اس تجربے کے بانی نہیں ہیں۔ خواجہ محمد زکریا اکبر الہ آبادی پر لگنے والے ایک اعتراض کو شدت سے رد کرتے ہیں۔ بعض حلقوں کی جانب سے اکبر الہ آبادی کو بار بار قدامت پسند شاعر قرار دیا گیا۔ خواجہ محمد زکریا اس الزام کو دلیل اور اکبر کی شاعری میں موجود ہیئت کے تجربات سے رد کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جو نقاد اکبر کو قدامت پسند شاعر ثابت کرنے پر زور قلم صرف کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کوئی قدامت پسند شخص اسالیب اور اصناف میں روایت سے بغاوت نہیں کر سکتا۔ اگر اکبر نے گھسے پٹے اور فرسودہ اسالیب میں متعدد اضافے کیے اور اصناف میں نت نئے تجربات سے جھجک محسوس نہیں کی تو وہ نئے خیالات کے قبول کرنے میں کس طرح رجعت پسند ہو سکتے ہیں۔"(۱۶)

مندرجہ بالا ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ خواجہ محمد زکریا اپنی تحقیق میں دیانت داری اور انصاف کو بڑی سے کام لیتے ہیں۔ اپنے ممدوح کی خوبیاں اور خامیاں دونوں بیان کرتے ہیں۔ شاعر کی شاعری کا جائزہ فنی اور فکری دونوں حوالوں سے لیتے ہیں۔ شاعر کے ہاں برتی جانے والی اصناف کا جائزہ تاریخی تناظر میں لے کر شاعری کی کامیابی یا ناکامی کا تعین کرتے ہیں اور جس پر لکھتے ہیں اس کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی تحقیق و تنقید کا درست منہاج ہے جس پر ہر اچھے محقق اور نقاد کو عمل کرنا چاہیے۔

"اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" کا چھٹا باب اکبر الہ آبادی کی نثر نگاری سے بحث کرتا ہے۔ اکبر کی نثر میں مکاتیب، مضامین اور تراجم شامل ہیں۔ خواجہ محمد زکریا بتاتے ہیں کہ اکبر نے کثیر تعداد میں اپنے ہمعصروں کو خطوط لکھے اور یہ خطوط تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ شاید ہی کسی دوسرے اُردو ادیب و شاعر نے اتنے خط لکھے ہوں۔ اکبر کے خطوط کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے اکبر الہ آبادی کے خطوط کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اکبر کے خطوط کے مجموعوں پر بات کرنے کے بعد خطوط اکبر کی لسانی اور ادبی خوبیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ان کے خیال میں اکبر کے خطوط میں جو اہم خوبیاں پائی جاتی ہیں ان میں سادگی، بے ساختگی، شوخی، ذکاوت، طنز وغیرہ ہیں۔ اسی طرح یہ خطوط اکبر کے شخصی اوصاف پر بھی اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی نے ادبی مضامین بھی تحریر کیے۔ اکبر کی مضمون نگاری کا آغاز اودھ پنچ سے ہوا۔ خواجہ محمد زکریا کو اپنے تحقیقی کام کے دوران اکبر کے تقریباً 40 مضامین ملے۔ جنھیں انھوں نے مختلف رسائل سے اکٹھا کر کے ایک مجموعہ کی شکل دی اور یہ مجموعہ "نثر اکبر الہ آبادی" کے عنوان سے مجلس ترقی ادب لاہور سے 2008ء میں شائع ہوا۔ خواجہ محمد زکریا اکبری نثر نگاری کے بارے اپنے خیالات کو یوں قلمبند کرتے ہیں۔

"اکبری نثر کے مختلف رنگ ہیں۔ کہیں قدیم انداز میں قافیہ پیمائی، لفظی رعایتیں اور ہم وزن نثری

ٹکڑے، کہیں بے قافیہ، رواں دواں اور سیدھی سادی نثر، تاہم اس نثر کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ نہ تو حالی کی نثر جیسی سادہ ہے اور نہ سرور وغیرہ کی طرح دقیق۔" (۱۷)

اکبر الہ آبادی نے اپنی زندگی میں دو کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ ایک کتاب ولفرڈ سکاوَن بلنٹ کی کتاب "فیوچر آف اسلام" تھی۔ اکبر الہ آبادی نے اس کتاب کا ترجمہ "مسلمانوں کی حالت آئندہ" کے نام سے کیا اور یہ ترجمہ 1884ء میں شائع ہوا۔ اکبر نے بلنٹ کی بعض اور تحریروں کا بھی ترجمہ کیا۔ ان تراجم میں اکبر نے سلیس اور رواں نثر لکھی ہے اور کوشش کی ہے کہ مصنف کے خیالات کو جتنا درستی سے ہو اُردو میں منتقل کر دیا جائے۔ بقول خواجہ محمد زکریا "اکبر بطور مترجم بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔"

خواجہ محمد زکریا کا تحریر کردہ پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ "اکبر الہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" اپنی خوبیوں اور تجزیاتی گہرائی کے اعتبار سے اُردو زبان میں لکھے جانے والے چیدہ مقالات میں شامل ہوتا ہے اور اُردو کے موجودہ مقالہ جات تحریر کرنے والے ان سے سیکھ سکتے ہیں کہ کیسے ایک اعلیٰ درجے کا مقالہ تحریر کیا جاتا ہے۔

ادبی تاریخ نگاری

تحقیق میں ایک اہم موضوع ادبی تاریخ نگاری بھی ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے اس حوالے سے بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ جامعہ پنجاب نے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند" کا آغاز 1965ء میں کیا۔ اس کی کل چودہ جلدیں شائع ہوئیں۔ ان جلدوں میں عربی، فارسی، اُردو اور بنگالی اور مغربی پاکستان کی علاقائی زبان و ادب سے متعلق مواد شامل تھا۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، کی پہلی جلد کے پیش لفظ میں اس دور کے وائس چانسلر محمد علاؤالدین صدیقی نے اس منصوبے کی غرض و غایت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائر زندگی کی نشاندہی کی جائے جس سے برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی..... ہم نے کوشش کی ہے کہ جس جس زبان میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے رنج و مسرت، اپنی فکر و نظر، اپنی امنگوں اور عزائم کو مجسم کیا ہے ان کے شہ پاروں سے اور ان مصنفین سے اپنے ہم وطنوں اور باہر کی دنیا کو روشناس کروایا جائے تاکہ ہم پہچان سکیں کہ ہماری زندگی کس قسم کی تہذیب و ثقافت پر استوار ہے اور ہمیں اس بات کا

مستقل احساس ہو جاتا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان و ہند خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں، ایک ہی ثقافتی رشتے میں منسلک ہیں اور ایک ہی تہذیبی روایت کے علمبردار ہیں۔"(۱۸)

پنجاب یونیورسٹی نے یہ منصوبہ قومی اور ملی ضروریات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے شروع کیا تھا۔ اس کی اشاعتِ اول کی 'اردو ادب جلد سوم' میں خواجہ محمد زکریا کے پانچ مضامین "اردو تذکرے"، "سر سید احمد خاں کی قدیم نثر"، "مرزا ہادی رسوا اور ان کے ناول نگار معاصرین"، "شبلی کی فارسی شاعری اور گرامی کی فارسی شاعری" شاملِ اشاعت تھے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے جولائی 2008ء سے فروری 2017ء تک ڈائریکٹر شعبہ تاریخ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی خدمات سر انجام دیں۔ اس دوران دوسرے کئی کاموں کے علاوہ انھوں نے "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند" کی اردو ادب سے متعلق پانچ جلدوں کو از سرِ نو مرتب کیا اور اس میں چھٹی جلد کا اضافہ کیا۔ خواجہ محمد زکریا نے خود اس منصوبے میں کی جانے والی نظرِ ثانی کے بنیادی خدوخال کو تعارف (طبع ثانی) میں ان نکات میں سمیٹا ہے۔

1- ابواب کی ترتیب میں تبدیلیاں کر کے کتاب کو زیادہ مربوط بنا دیا گیا ہے۔
2- بہت سا مواد جو تکرار کی ذیل میں آتا تھا حذف کر دیا گیا ہے۔
3- اشعار میں طباعت کی متعدد اغلاط تھیں، اصل متون سے مقابلہ کر کے انھیں درست کر دیا گیا ہے۔
4- سنین کی متعدد اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے نیز ہجری اور عیسوی سنین میں مطابقت پیدا کی گئی ہے جس کے لیے تقویم کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔
5- جدید تحقیق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بعض جگہ حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔
6- آخر میں اشخاص، مقامات اور کتابوں کا اشاریہ ادا کیا گیا ہے جو اشاعتِ اول میں نہیں تھا۔

اگر ہم مندرجہ بالا نکات کو سامنے رکھیں، اور چھبیس سو چھبیس سو صفحات پر مشتمل چھ جلدوں پر نگاہ ڈالیں تو اس محنت، سخت کوشش اور تحقیقی کاوش کا احساس ہو سکتا ہے جو خواجہ محمد زکریا نے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے کی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر آپ ان جلدوں کی محض ورق گردانی کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ ابواب کے ابواب خواجہ محمد زکریا کے تحریر کردہ ہیں۔ یہاں میں خاص طور پر جلد پنجم (بیسویں صدی: شعری اور افسانوی ادب) کا حوالہ دوں گا۔ اس جلد کے باب نمبر 4 "پابند نظم کا پھیلاؤ" باب نمبر 5 "نظم میں نئے رجحانات" چھٹا باب "غزل گوئی" ساتواں باب "بیسویں صدی کے نصف

آخری شاعری" پر تو خواجہ محمد زکریا کا نام گرامی درج ہے لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھواں باب "بیسویں صدی کا افسانوی ادب" نواں باب "افسانوی ادب میں ترقی پسندی اور حقیقت نگاری" دسواں باب "بیسویں صدی کے نصف آخر میں افسانوی ادب" بھی انھی کے قلم سے نکلا ہے اگرچہ اس پر کسی بھی مصنف کے نام کی بجائے ادارہ درج ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت مسالہ کسی اور نے جمع کیا ہے اور اس پر زیادہ محنت خواجہ محمد زکریا کی ہو اور انھوں نے اسے اپنے نام سے شائع کرنے کی بجائے ادارہ سے منسوب کر دیا ہو۔

خواجہ محمد زکریا نے زیر نظر تاریخ کی جلد پنجم اور ششم کی از سر نو تدوین و تکمیل کی۔ انھوں نے "جلد ششم" "اردو ادب بیسویں صدی: دیگر اصناف" کے پیش لفظ میں یوں اشارہ کیا ہے:

"پانچویں جلد چوں کہ از سر نو لکھی گئی اس لیے اس کی تکمیل 2012 تک مکمل ہو سکی۔ پانچویں اور چھٹی جلدیں مجموعی طور پر [illegible] سو چودہ صفحات پر مشتمل ہیں اور یہ تقریباً تمام کی تمام از سر نو تیار کی گئی ہیں۔"(۱۹)

جلد ششم میں ڈراما نگاری، طنز و مزاح، شخصیت نگاری، سفرنامہ، انشائیہ، اسالیب نثر، مذہبی نثر، مذہبی شاعری، تحقیق و تنقید اور صحافت میں اردو کے عنوانات کے تحت تحریریں شامل ہیں۔ اس جلد میں بھی بہت سی تحریریں خواجہ محمد زکریا کی اپنی تحریر کردہ یا ان کی نظر ثانی کردہ ہیں۔ یوں ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انھوں نے اس منصوبے پر کس قدر سنجیدگی اور محنت سے کام کیا اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے اسے تکمیل تک پہنچایا اور پنجاب یونیورسٹی کی بہترین علمی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب سے وابستہ لوگوں کے لیے عمدہ تاریخ نویسی کے نمونے فراہم کیے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ نویسی میں ان کا یہ کام بھی طویل عرصے تک یاد رکھا جائے گا اور باذوق قاری اس کی داد دیتے رہیں گے۔

ڈاکٹر گیان چند اردو کے نامور محقق ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی تواریخ پر ایک مبسوط تحقیقی و تنقیدی کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" تحریر کی ہے۔ گیان چند نے "تاریخ ادبیات پاکستان و ہند" کی پانچ جلدوں کی پہلی اشاعت کا تفصیلی جائزہ 84 صفحات میں لیا ہے۔ انھوں نے ان پانچ جلدوں کے محاسن اور خرابیوں دونوں پر بات کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے اس میں موجود خرابیوں کی نشاندہی کے باوجود اس کے بارے میں مثبت رائے ان الفاظ میں دی تھی۔

"جب تک ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ مکمل ہو کر سامنے نہیں آ جاتی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی یہ تاریخ، پورے اردو ادب کی اہم ترین تاریخ رہے گی۔"(۲۰)

یاد رہے کہ گیان چند نے یہ رائے پہلی اشاعت کی پانچ جلدوں کے بارے میں دی تھی۔ خواجہ محمد

زکریا نے جب ان پانچ جلدوں پر نظرِ ثانی کی تو انھوں نے تقریباً ان تمام اغلاط کو درست کرنے کی کوشش کی جن کی نشاندہی گیان چند نے کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان خامیوں پر بھی قابو پایا جو گیان چند کی نظر سے رہ گئی تھیں۔ اس میں قابلِ قدر اضافے کیے جیسے کتاب میں اشاریہ کا اضافہ کیا جو تحقیقی کتابوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چھٹی جلد کا اضافہ کر کے اس میں بیسویں صدی کے ادب کو بھی شامل کر دیا۔ اب جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ کے مکمل ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا تو ہم پنجاب یونیورسٹی سے شائع ہونے والی اس کتاب کو اُردو کی بہترین تاریخ قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔

تاریخ نویسی میں خواجہ محمد زکریا کا اصل کارنامہ "مختصر تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند" ہے۔ اس میں انھوں نے گیارہ سو صفحات پر مشتمل ایک جلد میں آغاز سے بیسویں صدی تک اُردو ادب کی تاریخ مرتب کی ہے۔ چوں کہ اس کام میں انھیں ادارے کے دیگر افراد کی معاونت حاصل رہی ہے۔ اس لیے انھوں نے سرورق پر خود کو مدیر عمومی تحریر کیا ہے اور میرے خیال میں یہ تحقیقی اور علمی دیانت کی اعلیٰ مثال ہے۔ یہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 2016ء میں پہلی بار چھپی اور 2020ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔ اس کا انتساب "پاکستان و ہند کی اسلامی تہذیب کے نام" ہے۔ اپنے پیش لفظ میں اسے انھوں نے پونے تین ہزار صفحات پر مشتمل "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند" کی چھ جلدوں کا گیارہ سو صفحات پر مشتمل خلاصہ قرار دیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا اپنے پیش لفظ میں اس کتاب میں اختیار کیے گئے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تلخیص کے لفظ سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ چھ جلدی تاریخ کی باب وار تلخیص ہے۔ ایسا کرنا مناسب نہیں تھا ورنہ پوری کتاب کا ربط و تسلسل بری طرح متاثر ہوتا اور قاری کو بار بار آگے پیچھے جانا پڑتا۔ چناں چہ چھ جلدوں کو ایک ہی جلد میں بہتر طریقے سے ترتیب دینے اور منطقی ربط بڑھانے کے لیے کتاب کو تئیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر ابواب کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ اُردو ادب کی مکمل تاریخ (آغاز سے بیسویں صدی تک) صاف شفاف انداز میں ایک بہتر سانچے میں ڈھل گئی ہے۔"(۳۱)

خواجہ محمد زکریا کی ہر تحریر میں آپ کو خیال اور بیان ہر دو واضح انداز میں ملتے ہیں۔ انھوں نے ایک ہی پیراگراف میں سارے طریقے کی وضاحت بھی کر دی ہے اور زیرِ نظر کتاب کے خدوخال بھی نمایاں کر دیے ہیں۔ آگے چل کر وہ مزید کچھ باتوں کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''کتاب کے آخر میں ''ابواب اور ابواب نگار'' کے زیرِ عنوان تفصیل مہیا کی گئی ہے کہ کون کون سے ابواب کن کن کی نگارشات کا نتیجہ ہیں۔ اکثر ابواب مدیرِ عمومی نے از سرِ نو لکھے ہیں۔ لیکن جن ابواب میں ریسرچ سکالرز سے مدد لی گئی ہے اور مدیرِ عمومی نے ترمیم و اضافہ کیا ہے وہاں [illegible] اور [illegible] لکھا گیا ہے۔ باقی مقامات پر ان اہلِ قلم کے نام درج کیے گئے ہیں جنھوں نے چھ جلدی تاریخ کے لیے ابواب رقم کیے تھے۔'' (۳۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اپنے کام میں دیانت دار ہیں اور اپنے ساتھ کام کرنے والوں لوگوں کو ان کا جز حصہ دیتے ہیں۔ ''مختصر تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند: اُردو ادب آغاز سے بیسویں صدی تک'' اس کی خوبصورت مثال ہے۔ اُردو میں بہت سی تواریخِ ادب موجود ہیں۔ رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر صادق نے اپنی تواریخ انگریزی زبان میں تحریر کیں جبکہ محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی کی ضخیم تاریخ ادبِ اُردو اور ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید کی مختصر تواریخ تک، اُردو ادب میں تاریخ نویسی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ان سب میں بلاشبہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادبِ اُردو'' سب سے جامع اور اہم تاریخ ہے اس کمی کے ساتھ کہ یہ صرف انیسویں صدی تک کے ادب تک کا احاطہ کرتی ہے اور بیسویں صدی کی جلد کی تکمیل جالبی صاحب نہ کر پائے۔ ایسے حالات میں ہم جب خواجہ محمد زکریا کی مدون کردہ اس تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اپنے اختصار کے باوجود یہ اُردو زبان و ادب کے سفر کا بہت اچھا احاطہ کرتی ہے اور بیسویں صدی کے اُردو ادب کو بھی اپنے احاطہ بیان میں لاتی ہے۔ یوں یہ شاید اب تک کی تواریخ میں سب سے زیادہ اپ ٹو ڈیٹ ہے البتہ اس کے مطالعہ سے ایک بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کا اکتیسواں باب ''بھارت میں اُردو ادب'' کافی تشنہ ہے اگر اسے بھی بھرپور بنا دیا جائے تو یہ کام اور زیادہ قابلِ تعریف ہو جائے گا۔

''مختصر تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند: اُردو ادب آغاز تا بیسویں صدی'' اکتیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اگرچہ ان ابواب کو مختلف افراد نے تحریر کیا ہے اور ان میں اُردو زبان و ادب کے متنوع پہلوؤں اور موضوعات کو سمویا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس کتاب میں تسلسل اور ہم آہنگی موجود ہے جو ظاہر ہے مدیرِ عمومی کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے۔ اس تاریخ کو مدون کرنے میں تحقیق نگاری کے جدید طریقوں کو مدِنظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً اس کا پہلا باب ''سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر: ۱۷۰۷ تا ۲۰۰۰ء'' میں بھی بہت اختصار سے کام کیا گیا ہے تاکہ اس پس منظر کی وضاحت ہو جائے جس میں ہندوستان میں

مسلمانوں کی آمد سے اس تہذیبی تالیف کا آغاز ہوا جس نے ایک نئی زبان کی داغ بیل ڈالی۔

دوسرا باب ”اُردو زبان کی ابتداء کے بارے میں نظریات“ میں اُردو زبان کے آغاز کے بارے میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی، پروفیسر احتشام حسین، اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے تصورات سے بحث کی گئی ہے اور اُردو زبان کی ساخت، حرف و نحو اور دیگر لسانی عناصر کی وضاحت سے اس زبان کے پنجاب میں آغاز ہونے کے نظریے کو قبول کیا گیا ہے۔

یہاں سے شروع کر کے ہم دیکھتے ہیں کہ ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں ”اُردو ادب کی پہلی چند صدیاں“ ”دکن میں اُردو ادب کا فروغ“ ”اُردو شاعری کا شمالی ہند میں آغاز ... ایہام گوئی اور ردِ عمل“ جیسے ابواب برسوں اور صدیوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے اُردو ادب کے خدوخال واضح ہوتے چلے جاتے ہیں تو ابواب میں زمانی انتشار آتا جاتا ہے مگر تفصیلات بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کتاب کے ساتویں باب ”دہلی میں شاعری کا فروغ۔ دورِ اول“ میں سودا اور میر جیسے شاعروں کے کام کا احاطہ کیا گیا جبکہ ”نظیر اکبر آبادی“ پر الگ باب موجود ہے کیوں کہ نظیر کے انفرادی اختلاط دوسرے شاعروں سے الگ اپنے تذکرے کی متقاضی تھے۔ اسی طرح جب اس کتاب کی تدوین کرنے والے ”لکھنؤ میں شاعری“ پر بات کرتے ہیں تو ”لکھنؤ میں مرثیہ نگاری“ پر الگ باب قائم کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں ایک ترتیب، توازن اور تسلسل دکھائی دیتا ہے جس کے لیے کتاب کے مدیرِ عمومی ہی داد کے مستحق ہیں کہ مختلف لوگ ایک ہی اوقات میں، الگ الگ موضوعات پر تحریر و تصنیف میں مصروف تھے۔ ان سب کے لکھے کو باہم مربوط کر کے ایک کتاب میں ڈھالنے کا فریضہ تو بہر طور خواجہ محمد زکریا کو ہی ادا کرنا تھا۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کی منصوبہ بندی بہت اچھی طرح کی گئی ہے، کس موضوع یا کس تخلیق کار کو کتنی جگہ دی ہے اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ”تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند“ کی چھ جلدوں کی شکل میں 26 سو سے زیادہ صفحات کا مواد موجود تھا۔ اس میں سے ایک تہائی مواد کو اس طرح الگ کرنا کہ تسلسل نہ ٹوٹے اور کتاب کا معیار بھی خراب نہ ہو، ایک ایسا مرحلہ تھا جس کو مدیرِ عمومی بہت کامیابی کے ساتھ کر گزرے ہیں۔ اس حوالے سے خواجہ محمد زکریا کے پیش لفظ میں موجود احوال ہماری رہنمائی کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

”اس مختصر تاریخ میں وہ سارا مواد موجود ہے جو چھ جلدی کتاب میں شامل ہے۔ اختصار کے لیے

تنقیدی مواد کم کر دیا گیا ہے، بعض اقتباسات ترک کیے گئے ہیں لیکن ادبا، شعرا کے سوانحی حالات اور تصانیف کی تعداد میں بہت کم کمی بیشی کی گئی ہے۔

"بعض ایسے ابواب جن کا ادب سے براہ راست تعلق نہیں، حذف کر دیے گئے ہیں۔ ان سے مستفید ہونے کے لیے پچ جلدی تاریخ ادبیات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اسی طرح کہیں کہیں بعض کم معروف شعرا اور نثر نگاروں کے نام بھی قلم زد کیے گئے ہیں۔

"مجموعی طور پر یہ جلد ایک حد تک مفصل منصوبے کا متبادل ثابت ہوگی اور مجھے امید ہے کہ ہر درجے کے طلبہ و طالبات کے علاوہ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اسے تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے قابل اعتنا پائیں گے۔" (۴۳)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خواجہ زکریا نے اپنے پیش لفظ میں ان تمام ترجیحات کی وضاحت کر دی ہے جن کو یک جلدی تاریخ کے لیے خاص طور پر رکھا گیا ہے۔ موجود مواد میں کیا رکھ جائے گا اور کیا نکالا جائے گا۔ اس کا فیصلہ کرنے والے فرد کو مضبوط قوت ارادی اور قوت فیصلہ کا مالک ہونا چاہیے۔ اسے تحقیقی اصولوں سے آگاہی ہونی چاہیے اور مواد کو پرکھنے کے لیے علمی استعداد اور ادبی ذوق کا ہونا بھی لازم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مواد کے مختلف ٹکڑوں کو نئے سرے سے ایک لڑی میں پرو کر اس میں تسلسل اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت بھی لازم ہے۔ خواجہ محمد زکریا ان تمام خصوصیات کے حامل ہیں اس لیے وہ اپنے اس منصوبے میں کامیابی حاصل کر سکے ہیں۔

اوپر کی گئی تمام بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں خواجہ محمد زکریا کی مرتب کردہ "مختصر تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند: اُردو ادب آغاز تا بیسویں صدی" اُردو ادب کی واحد مکمل اور مبسوط تاریخ ادب اُردو ہے جو نہایت مختصر مگر جامع انداز میں صدیوں پر پھیلے اُردو زبان و ادب کے سفر کا احاطہ کرتی ہے اور جب تک کوئی اور تاریخ اس سے بہتر انداز میں مکمل ہو کر سامنے نہیں آ جاتی ہمیں اسی پر بھروسا کرنا ہوگا۔

تدوین متن

تحقیق کا ایک اہم شعبہ تدوین متن بھی ہے۔ اس میں اُردو زبان و ادب میں بہت سے نامور لوگ موجود ہیں۔ موجودہ عہد میں اس شعبے سے وابستہ جو افراد مدون ہیں اور تدوین متن میں مصروف ہیں ان میں بلاشبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ایک نہایت اہم نام ہیں۔ ان کے تدوین متن کے کام کا آغاز 1988ء میں

"کلیات مجید امجد" (زمانی ترتیب) سے ہوتا ہے اور تا حال ان کا سب سے اہم تدوینی کام بھی ہے کہ ایک طرف تو اس کے کئی نئے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جو اس کام کے معیاری ہونے اور اردو شاعری کے قارئین میں اسے مستند سمجھے جانے کی دلیل ہے۔ دوسری طرف کلیات مجید امجد کی سلیقے سے تدوین، مجید امجد کے کلام کو بہتر سے بہتر بناتے چلے جانے کی روش نے مجید امجد کی شعری استحکام میں بھی نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مجید امجد کا جب 1974ء میں انتقال ہوا تو ان کا صرف ایک شعری مجموعہ "شب رفتہ" شائع ہو سکا تھا۔ مجید امجد کے انتقال کے فوراً بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ "شب رفتہ کے بعد" شائع ہوا مگر اس میں بہت سی اغلاط موجود تھیں۔ اسی طرح مجید امجد کی شاعری کا ایک کلیات "تاج سعید نے مرتب کر کے بھی شائع کیا تھا مگر اس میں زیادہ تر "شب رفتہ" اور "شب رفتہ کے بعد" کے مواد کو شائع کیا گیا تھا۔ ان میں اضافہ بہت کم تھا۔ مجید امجد کے ابتدائی دور کا بہت سا کلام جو "عروج" "جھنگ" اور دیگر رسائل میں بکھرا ہوا تھا۔ ہنوز اس بات کا متقاضی تھا کہ اسے جمع کر کے سلیقے سے مرتب کیا جائے۔ مجید امجد چوں کہ خواجہ محمد زکریا کی عمر بھر کی دلچسپیوں کا مرکز رہے ہیں اور شاید اس حوالے سے ہم مجید امجد کو خوش قسمت قرار دے سکتے ہیں جسے خواجہ محمد زکریا جیسا محقق اور نقاد میسر آیا جس نے مسلسل اس کے حوالے سے تنقیدی اور تحقیقی کام کر کے مجید امجد کی شاعری کو اردو قارئین کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا اس کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی اور دیگر جامعات کے اردو نصاب میں مجید امجد کو شامل کر کے اس کے قارئین کے دائرے میں اضافہ کرتے رہے۔

"کلیات مجید امجد" کی تحقیق، تدوین اور ترتیب کا فریضہ خواجہ محمد زکریا نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ 1988ء میں اپنی اولین اشاعت سے 2014ء تک (مجید امجد صدی ایڈیشن) ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ محمد زکریا اس کام کو ہر لحاظ سے کامل بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہے ہیں۔ "کلیات مجید امجد" کی اولین اشاعت کے پیش لفظ میں خواجہ محمد زکریا صاحب نے بہت سی باتوں کی وضاحت کر دی تھی مگر اس کے باوجود بعض حلقوں نے اعتراض کیا کہ مجید امجد کا ابتدائی کلام آغاز میں شامل کر کے شاعر کے امیج کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ ہمارے عہد کے نامور شاعر اور ماورا پبلشرز کے مالک خالد شریف نے عرض ناشر کے زیر عنوان خواجہ محمد زکریا کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

"تین سال قبل جب میں نے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب سے مجید امجد کے کلام کی ترتیب و تدوین کی درخواست کی تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس کام کو اس قدر سنجیدگی سے لیں گے۔ مجھے صرف یہ معلوم

تھا کہ خواجہ صاحب کے پاس مجید امجد کا کچھ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ پھر یاد دہانیوں، تقاضوں اور ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ چلا، تو معلوم ہوا کہ مجید امجد کا سارا مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام خواجہ صاحب کو حفظ ہے۔ مسودے کی تیاری، کتابت شدہ مواد کی پروف ریڈنگ اور بعد کے مراحل میں انھوں نے جس باریک بینی اور عرق ریزی سے کام لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی اس توجہ کے باعث ہم میں سے کچھ دوست یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ خواجہ صاحب کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تو دراصل اس کام پر ملنی چاہیے تھی۔"(۲۴)

خواجہ محمد زکریا کی تمام محنت اور لگن اور خالد شریف کے اس خراجِ تحسین کے باوجود "کلیاتِ مجید امجد" کی اولین اشاعت میں متن کی صحت پوری طرح قائم نہ رہ سکی۔ بعض اغلاط راہ پا گئیں۔ سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی ایک کاپی کے غلط جڑنے سے مجید امجد کی واحد طویل نظم "دَوامِ سلطنتِ غم سے نہ اقلیم عرب" بے ربط ہو گئی۔ یہ سب اغلاط پہلے چار ایڈیشنوں میں چلتی رہیں۔ اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن الحمد پبلی کیشنز سے شائع ہوا تو ان اغلاط کی اصلاح کی گئی۔ اسے "کلیاتِ مجید امجد" کی طبع نو قرار دیا گیا اور یہ ایڈیشن 2003ء میں شائع ہوا۔ خواجہ محمد زکریا نے کتاب کی ترتیب میں بھی کچھ تبدیلی کی اور اسے چار درج ذیل حصوں میں تقسیم کر دیا۔

1- شب رفتہ (۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۸ء)
2- روز رفتہ (۱۹۳۲ء تا ۱۹۵۸ء)
3- امروز (۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء)
4- فردا (۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۴ء)

اس ترتیب سے شب رفتہ میں شامل ۸۴ تخلیقات سب سے پہلے آ گئیں۔ اس کے بعد "روز رفتہ" میں ۱۱۹ تخلیقات تھیں جن کا زمانۂ تخلیق تو شب رفتہ والا تھا مگر شاعر نے شب رفتہ کی اشاعت کے وقت انھیں کتاب میں شامل نہیں کیا تھا۔ "امروز" کے زیرِ عنوان ۸۹ تخلیقات تھیں جو ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۸ء کے دس سالوں میں معرضِ تخلیق میں آئیں اور سب سے آخر میں "فردا" کے زیرِ عنوان ۱۹۳ تخلیقات کو رکھا گیا تھا۔ یہ ساری نظمیں "مفعلن فعلن" کے آہنگ میں تھیں۔ اس آہنگ میں میر تقی میر نے دو، تین سو غزلیں کہیں اور مجید امجد نے بھی اس آہنگ میں چھ سات سال میں ۱۹۳ نظمیں تخلیق کیں۔ ان کے معیار کے بارے میں ناقدین میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آنے والے دنوں میں جب بھی "مجید امجد" کے شعری قد و قامت کا تعین کیا جائے گا اس کی یہ نظمیں اس

میں بڑا بھرپور کردار ادا کریں گی۔

''کلیات مجید امجد طبع نو'' ۲۰۰۳ء سے ۲۰۱۸ء کے درمیان پانچ بار چھپی۔ مگر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی بے چین اور کام کو کامل انداز میں سرانجام دینے والی شخصیت انھیں اس میں موجود بعض اغلاط کی اصلاح اور اسے بہتر سے بہتر بنانے پر اکساتی رہی یوں جون ۲۰۱۴ء میں مجید امجد صدی ایڈیشن شائع ہوا جس کے حوالے سے خود خواجہ صاحب نے لکھا:

''زیر نظر اشاعت جون ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آ رہی ہے۔ قبل ازیں ۲۰۰۳ء اور ۲۰۱۸ء کے درمیان چند اور ایڈیشن بھی طبع ہو چکے ہیں۔ موجودہ ایڈیشن میں چند ایسی اغلاط بھی درست کر دی گئی ہیں جو باقی رہ گئی تھیں۔ علاوہ ازیں اس ایڈیشن میں اضافوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ کلیات جملہ قارئین کے لیے پہلے سے زیادہ قابل فہم ہو گئی ہے۔'' (۲۵)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خواجہ محمد زکریا کس طرح اپنے تدوین کے کام کو بہتر سے بہتر بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ تدوین و متن کا کام بظاہر تو بہت آسان اور سادہ دکھائی دیتا ہے اور تحقیق سے ناآشنا ذہن کبھی بھی اس کی مکمل اہمیت سے آگاہ نہیں ہوتے۔ یہ دراصل ریت سے سونے کے ذرے تلاش کرنے کا عمل ہے اور جو لوگ یہ کام کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں صرف وہی اس کی اصل اہمیت اور افادیت سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس محنت اور لگن کی داد دے سکتے ہیں جو تدوین متن میں شامل ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ خواجہ محمد زکریا نے مجید امجد کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کام ہمیشہ جاری رکھا ہے۔ کلیات مجید امجد اس کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مجید امجد کی شاعری کا ایک انتخاب ''انتخاب مجید امجد'' کے نام سے مرتب کیا ہے جسے الحمد پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔

''شب رفتہ'' میں موجود اغلاط کی تصحیح کر کے متن کو درست انداز میں ۲۰۰۷ء میں الحمد پبلی کیشنز ہی سے شائع کروایا۔ خواجہ محمد زکریا کے اہم تنقیدی مجموعے ''چند اہم جدید شاعر'' مطبوعہ مثال پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۲۰ء میں پانچ مضامین مجید امجد کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھے گئے ہیں جبکہ حسنا مجید امجد کا انٹرویو ''مجید امجد کی باتیں'' بھی اس اشاعت کا حصہ ہے۔

مجید امجد کے ساتھ ساتھ اکبر الہ آبادی اور حفیظ جالندھری کی شخصیات اور کلام بھی خواجہ محمد زکریا کی دلچسپی کا پوری زندگی محور رہے ہیں۔ اکبر الہ آبادی پر ان کے مقالے پر ہم گفتگو کرتے ہیں اور ان دونوں

وہ کلیات اکبر الہ آبادی کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں۔ جب یہ شائع ہوگا تو یقیناً خاصے کی چیز ثابت ہوگا۔ حفیظ جالندھری کے حوالے سے ان کے مضامین کا تذکرہ تو تنقید کی ذیل میں آئے گا۔ یہاں ہم ''کلیاتِ حفیظ جالندھری'' پر بات کریں گے۔ جس کی ترتیب اور تدوین خواجہ محمد زکریا نے کی اور اسے الحمد پبلی کیشنز نے ۲۰۰۵ء میں لاہور سے شائع کیا۔

کسی بھی شاعر کا کلام مرتب کرنا خود کو ایک نئی طرح کی مشکل سے دوچار کرنا ہوتا ہے کیوں کہ ہر شاعر کی تدوین شاعری کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر آپ نے ایک شاعر مجید امجد کے کلیات کو مرتب کر لیا ہے تو آپ کے لیے دوسرے شاعر حفیظ جالندھری کی کلیات مرتب کرنا بالکل آسان ہو جائے گا۔ یہ بات درست ہے کہ تحقیق و تدوین کا ہر کام آپ کو بہت کچھ سکھاتا ہے جو آپ کے آئندہ کام میں معاون ثابت ہوتا ہے لیکن اس بات میں بھی شک نہیں کہ ہر متن کی اپنی ضروریات اور مشکلات ہوتی ہیں جن سے تدوین متن کرنے والے کو بہرحال گزرنا پڑتا ہے۔

حفیظ جالندھری کا پہلا شعری مجموعہ ''نغمہ زار'' 1925ء میں جبکہ ان کا آخری مجموعہ ''چراغِ سحر'' 1972ء میں شائع ہوا۔ حفیظ نے غزل اور نظم ہر دو اصناف میں اپنی تخلیقی قوت کا اظہار کیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے ''کلیاتِ حفیظ جالندھری'' میں حفیظ کے شعری مجموعوں کو تاریخی اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے اس پر ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں حفیظ جالندھری کی سوانح، شخصیت اور شاعری کے بارے میں قابل قدر کام کیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے اپنے ''مقدمہ'' حفیظ جالندھری کی شعری تصنیفات، نثری تصنیفات اور بچوں کے لیے لکھے گئے ادب کا احاطہ کرتے ہوئے حفیظ کا مقام ان الفاظ میں متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

''حفیظ کی نثر ان کی شاعری کی وجہ سے زندہ ہے جبکہ شاعری اپنے بل پر زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ حفیظ نے غزل، نظم اور گیت کی اصناف میں شاعری کی ہے۔ علاوہ ازیں کامیاب ترانے اور پر تاثیر شخصی مرثیے لکھے ہیں۔ ''شاہنامہ اسلام'' ایک طویل ''ایپک'' ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ بچوں کے لیے انھوں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں جنھیں بچے دلچسپی سے پڑھتے ہیں کیوں کہ وہ ان کی نفسیات کو مد نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔''(۳۶)

اپنے زیر نظر مقدمے میں خواجہ محمد زکریا نہ صرف حفیظ جالندھری کی شاعری کی فنی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ مختلف اصناف کے حوالے سے ان کے معاصر شاعروں سے ان کا موازنہ کرکے

حفیظ جالندھری کی شاعرانہ انفرادیت کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ حفیظ جالندھری کو اقبال کے بعد ابھرنے والی چند نمایاں ترین آوازوں میں سے ایک قرار دیتے ہیں اور حفیظ کی شاعری کی فنی خوبیوں کو سراہتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے حفیظ جالندھری کے شعری کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ شاہنامۂ اسلام، پہلا، دوسرا حفیظ کے چار شعری مجموعے اور تیسرا بچوں کے لیے لکھا گیا۔ حفیظ کا شاعرانہ کلام۔ زیرِ نظر "کلیاتِ حفیظ جالندھری" چار شعری مجموعوں پر مشتمل ہے اور اس کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں اپنے مقدمے میں "یہ کلیات کیوں" کے عنوان سے خواجہ محمد زکریا نے یوں وضاحت کی ہے:

"حفیظ کا انتقال 1982ء میں ہوا۔ وفات سے ربع صدی پہلے انھوں نے نغمہ زار، سوز و ساز اور تلخابۂ شیریں کے نئے ایڈیشن چھپوائے تھے مگر ان کا طباعتی معیار اچھا نہیں تھا۔ اس پر مستزاد متن میں بہت سی اغلاط کا در آنا تھا۔ چراغِ سحر ان کی وفات سے تقریباً دس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس میں بھی کتابت کی بہت سی غلطیاں تھیں اور معیارِ طباعت معمولی تھا۔ بعد میں یہ کبھی شائع نہیں ہوئی۔ حفیظ اپنی تمام دیگر تصانیف پر ان چار مجموعوں (یعنی نغمہ زار، سوز و ساز، تلخابۂ شیریں اور چراغِ سحر) کو ترجیح دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں ان کا عمومی مقام انھی مجموعوں کی وجہ سے ہے لیکن تقریباً نصف صدی سے نایاب ہونے کی وجہ سے یہ قارئین کی دسترس میں نہیں رہے ہیں۔ کتب خانوں سے بھی غائب ہو چکے ہیں۔ اس لیے نئی نسلوں سے حفیظ کے مقام کو متعارف کرانے کے لیے ان کی اشاعتِ نو کی سخت ضرورت تھی۔" (۴۷)

میرے خیال میں کلیاتِ حفیظ جالندھری مرتب کر کے خواجہ محمد زکریا نے ایک اہم ادبی اور شعری ضرورت کو کامیابی سے پورا کیا ہے اور ان کی اس کاوش کی بدولت اب حفیظ کا کلام جوان نسل کی رسائی میں آ گیا ہے۔ وہ اس سے کتنا استفادہ کرتی ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

خواجہ محمد زکریا کا شعری متن کی تدوین کا سب سے اہم کام "کلیاتِ عدم: ترتیب و تدوین" ہے۔ عبدالحمید عدمؔ اُردو میں نہایت قادرالکلام شاعر تھے۔ جن کی شعر گوئی کا آغاز 1930ء میں ہوا۔ ابتداء میں رومانوی طرزِ فکر سے متاثر ہوئے۔ زیادہ تر نظمیں لکھیں، رفتہ رفتہ غزل کی طرف زیادہ رجحان ہوتا چلا گیا۔ ان کا سب سے مشہور شاعرانہ مجموعہ "خرابات" ہے۔ عبدالحمید عدم بہت مشہور شاعر تھے اور اپنے زمانے میں مشاعروں کی جان مانے جاتے تھے۔ بہت زود گو تھے۔ اس لیے انھوں نے بہت زیادہ لکھا۔ خواجہ محمد زکریا نے جب ان کے کلیات کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا تو کلیات اور دیوان مرتب کرنے کے کلاسیکی

اصول پر چلتے ہوئے عدم کی غزلیات کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا۔ یہ کام سخت محنت اور عرق ریزی کا متقاضی تھا۔ اس کام کے حجم کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کام کی فہرست 54 صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر دو دو مصرعے درج ہیں۔ یعنی اگر ایک سطر میں ایک مصرعہ آتا تو یہ فہرست ایک سو صفحات سے بڑھ جاتی ہے۔

عبدالحمید عدمؔ کے کلام کو ردیف وار مرتب کرنے میں حائل مشکلات کی جانب کتاب کے مقدمہ میں خود خواجہ محمد زکریا نے بڑے واضح اشارے کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"جیسا کہ اس مقدمے کے شروع میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے، عدم کے کل اڑتالیس شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکتیس مجموعوں میں صرف غزلیات ہیں، سات میں دیگر اصناف کے ساتھ غزلیات بھی موجود ہیں۔ چار مجموعے قطعات کے ہیں۔ باقی چھ مجموعے مختلف اصناف یعنی مثنوی، منظومات، رباعی نظموں وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ چوں کہ اڑتالیس مجموعوں کو ایک جلد میں سمیٹنا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے یہ طے کیا کہ تمام مجموعوں سے غزلیات کو الگ کر کے جلد اول کے طور پر چھاپا جائے۔ چوں کہ عدم کی شاعری میں آغاز سے انجام تک موضوعات کی تکرار اور یکسانیت ہے اس لیے انھیں زمانی ترتیب سے شائع کرنے کی افادیت بہت کم ہے البتہ الف بائی ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ قاری کو اپنی پسند کی غزل یا شعر تلاش کرنے میں کم زحمت اٹھانی پڑے۔" (۲۸)

یوں اس ترتیب سے خواجہ محمد زکریا نے اس مشہور شاعر کو مرتب کر کے اس کے قارئین سے جوڑے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ عبدالحمید عدم کے کلام میں موجود تکرار کی طرف ہر قاری اور نقاد آسانی اشارہ کر سکتا ہے۔ یہ تکرار کس نوعیت کی ہے۔ اسے کیسے دور کیا جا سکتا ہے اور عدم کا کلیات مرتب کرتے ہوئے تکرار سے بچنے کا کیا طریقہ ہے اس بات پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے خواجہ محمد زکریا ایک سنجیدہ محقق اور نقاد ہیں۔ اپنے فن کی باریکیوں کو سمجھنے والے اور اس فن کی نزاکتوں پر نگاہ رکھنے والے فرد ہیں۔ اس لیے انھوں نے عبدالحمید عدم کا کلیات شعر الف بائی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے مقدمے میں بڑی وضاحت کے ساتھ عدم کے کلام میں موجود تکرار کی نوعیت اور اسے دور کرنے کے طریقہ کار پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی لیے راقم نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ ہر متن کو مرتب کرنے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور خواجہ محمد زکریا نے ہر شعری متن کو اس کے داخلی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرتب کیا ہے۔ "کلیات عدم" میں موجود عیب تکرار کے حوالے سے خواجہ محمد زکریا کتاب کے

"مقدمہ" میں لکھتے ہیں:

"مشہور ہے کہ عدم نے مختلف مجموعوں میں اپنے کلام کی بہت تکرار کی ہے۔ یہ بات عمومی طور پر درست ہے لیکن یہ شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ پوری پوری غزل کی تکرار نسبتاً بہت کم ہے۔ عام طور پر دوسری بار شامل کرنے سے پہلے غزلیات میں اشعار کا اضافہ کر دیا گیا ہے، کہیں نیا مطلع کہہ کر باقی اشعار دہرا دیے گئے ہیں۔ کہیں مطلع اور مقطع نئے ہیں باقی اشعار پرانے ہیں، کہیں زمین وہی ہے لیکن اکثر اشعار نئے ہیں۔ صرف چند مصرعے یا دو تین اشعار پرانے ہیں۔ اکثر جگہ پرانی غزل کی زمین میں مکمل طور پر نئی غزل کہی گئی ہے۔ اس لیے کلیات کو تکرار سے پاک کرنا بڑا محنت طلب کام ہے جسے میں نے بہت وقت صرف کر کے انجام دیا ہے۔" (۴۹)

مندرجہ بالا اقتباس اس لیے درج کیا گیا ہے کہ قاری کو پوری طرح اس بات کی آگاہی ہو جائے کہ "کلیات عبدالحمید عدم" کی تدوین کے لیے کس طرح کے معیارات کی ضرورت تھی اور خواجہ محمد زکریا نے ان معیارات کو پورا کرنے کے لیے کیا حکمت عملی تیار کی۔ اس کے بعد ہم خواجہ محمد زکریا کے ایک اور اہم تدوینی کام "کلیات داغ" کی جانب آتے ہیں۔

فصیح الملک داغ دہلوی کا شمار غالب کے بعد آنے والے شعرا کی صف اول میں ہوتا ہے۔ داغ انیسویں صدی کے نصف آخر کے سب سے نمایاں غزل گو شاعر ہیں۔ داغ دہلوی کے شاعری کے چار دیوان گلزارِ داغ (1878ء)، آفتابِ داغ (1884ء)، مہتابِ داغ (1888ء)، اور یادگارِ داغ (1905ء) اور ایک مثنوی "فریادِ داغ" (1879ء) میں شائع ہوئے۔

خواجہ محمد زکریا کو چوں کہ اردو کی قدیم اصناف اور کلاسیکی شاعری سے خصوصی دلچسپی ہے۔ اس لیے داغ دہلوی کی غزل بھی انھیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ کلیات داغ مرتب کرتے ہوئے انھوں نے تاریخی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ جو دیوان پہلے شائع ہوا اسے پہلے جگہ دی ہے یوں قاری آسانی سے داغ کے فنی اور فکری ارتقا کے بارے میں جان سکتا ہے۔ داغ کا اصل فن غزل گوئی تھی۔ خواجہ صاحب نے ان کے چاروں دیوان اور ضمیمہ "یادگار داغ" میں شامل غزلوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کی کل غزلیں ایک ہزار چھتیس (1036) ہیں اور نامکمل غزلیں ان کے علاوہ ہیں۔ اپنے مقدمے میں خواجہ محمد زکریا داغ کی غزل اور شاعری کے اصل جوہر کی طرف اشارہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"داغ کی شاعری کا اصل جوہر ان کی خالص اردو ہے۔ وہ بہت اچھی فارسی جانتے تھے اور آرزو

لکھنوی کی طرح تراکیب سے دانستہ گریز بھی نہیں کرتے تھے۔ حسب ضرورت اضافتوں کو بے روک ٹوک استعمال کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا اسلوب بنیادی طور پر اُردو کا رنگ و آہنگ رکھتا ہے اور اس معاملے میں ان کی مماثلت اپنے استاد ذوق سے ہے۔ مصرعوں کی تراش خراش، شعر کی بے ساختگی اور روانی، لفظوں اور ٹکڑوں کی تکرار سے موسیقیت پیدا کرنا، محاورہ اور ضرب المثل سے شعر کو چمکانا، ایہام کو قریب نہ آنے دینا، اظہار و ابلاغ میں سہولت، مکالمہ، بذلہ سنجی، شوخی، لفظی رعایتوں کو ایسی سہولت سے برتنا کہ ان میں تصنع پیدا نہ ہو..... کلام داغ کی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے اسے خوب چمکایا اور مقبول خواص و عوام بنایا۔"(۲۶)

آپ نے دیکھا کہ خواجہ محمد زکریا کس خوبصورتی سے کلام داغ کی خوبیوں کو اختصار اور جامعیت سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشرقی شعریات خصوصاً اُردو غزل کی شعریات سے خوب واقف ہیں۔ غزل کو پرکھنے کے معیارات سے گہری شناسائی رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ غزل کے شعر کی اصل داد کن باتوں پر منحصر ہے۔

داغ دہلوی نے غزل کے ساتھ ساتھ کلکتے کی مشہور طوائف منی بائی حجاب سے اپنی محبت کی روداد کو "فریادِ داغ" نامی مثنوی میں محفوظ کیا تھا۔ داغ نے حجاب کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ناکام رہے اور جب حجاب نے داغ کو اپنانا چاہا تو وہ بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ بہر طور یہ بعد کی بات ہے۔ داغ کی مثنوی "فریادِ داغ" 1879ء میں شائع ہوئی جب آتش ابھی جوان تھا اور داغ کا عشق بھی۔ اس مثنوی کی داغ کے کلام میں یا خود اُردو مثنوی میں کیا اہمیت ہے۔ خواجہ محمد زکریا جب اس سوال کی طرف آتے ہیں تو وہ بڑی معروضیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور بغیر کسی رو رعایت کے درج ذیل بات کہتے ہیں۔

"مثنوی میں حجاب سے محبت کا سارا قصہ بہت سادہ اور رواں اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کی بحر وہی ہے جو زہرِ عشق کی ہے اور صنف مثنوی کی مشہور بحر ہے۔ مثنوی کے آخری حصے میں کلکتے سے واپس آ کر حجاب کی فرقت میں بسر ہونے والے ایام کا ذکر ہے اور اپنے دکھ درد اور تنہائی کا نقشہ مناسب الفاظ میں کھینچا ہے۔ مثنوی میں جذبات نگاری اچھی ہے۔ لیکن اس میں وہ شدت نظر نہیں آتی جو میر کی مثنوی "دریائے عشق" یا مرزا شوق کی "زہرِ عشق" میں ہے۔ یہ مثنوی داغ کی وجہ سے زندہ ہے۔ داغ اس کی وجہ سے نہیں جانے جاتے۔"(۳۱)

خواجہ محمد زکریا نے "مقدمہ" میں داغ کے مختلف دواوین کی اشاعت، اور دہلی اور لاہور سے کلیات

داغ کی اشاعت اور ان میں موجود اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے بالکل درست انداز میں زیرِ نظر کلیاتِ داغ کی توجیہہ دی ہے۔ اُردو شاعری کے قارئین کو داد دینا چاہیے کہ خواجہ محمد زکریا نے ایک معیاری اور تقریباً اغلاط سے پاک کلیاتِ داغ کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔

کلیات کی اس ترتیب میں تازہ حال "کلیاتِ حالی: شاعری" کی ترتیب و تدوین آتی ہے۔ یہ کلیات 2018ء میں المحمد پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ اس سے پیشتر "کلیاتِ نظمِ حالی" مجلس ترقی ادب لاہور سے دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ جسے انھیں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے مرتب کیا تھا۔ حالی کا دیوان اور مسدسِ حالی بھی آسانی دستیاب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سید تقی عابدی نے بھی "کلیاتِ حالی" مرتب کر کے 2016ء میں بک کارنر جہلم سے شائع کرا رکھی ہے۔ تو پھر حالی کے ایک نئے کلیات کی گنجائش کیسے نکلتی ہے۔ اس بات کا جواب خود خواجہ محمد زکریا اپنے "کلیاتِ حالی" کے "مقدمہ" میں یوں دیتے ہیں:

"مزید غور و خوض سے اندازہ ہوا کہ کلیاتِ حالی کی ایک اور تدوین کی ضرورت بہر حال باقی ہے۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب نے کلامِ حالی کو جس طرح عنوانات میں تقسیم کر کے ترتیب دیا ہے اس میں بہتری کی گنجائش نظر آئی۔ چنانچہ میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ان کی ترتیب میں بنیادی تبدیلیاں کی ہیں اور انھیں اپنے خیال کے مطابق بہتر بنایا ہے۔ غزلیات کو سب سے پہلا رکھا ہے۔ صدیقی صاحب نے قدیم اور جدید غزلیات کو الگ الگ کر دیا ہے مگر میں نے منشا حالی کے مطابق انھیں یکجا کر کے قدیم غزلوں پر قدیم کا لفظ لکھا ہے جبکہ "ق" کا نشان قطعہ بند اشعار کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ دیوانِ حالی کی غزلیات کے فوراً بعد جواہراتِ حالی (مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) میں جو چند غزلیں ہیں انھیں ایزاد کیا ہے۔" (۳۴)

خواجہ محمد زکریا نے "کلیاتِ حالی" میں غزلیات کو سب سے پہلے رکھا ہے اس کے بعد رباعیات ہیں۔ پھر قطعات کو جگہ دی ہے اور اس کے بعد منظومات (۱۸۶۷ء تا ۱۸۷۴ء) آتی ہیں۔ اس کے بعد مسدس مدوجزرِ اسلام اور ضمیمہ مسدس رکھا گیا ہے۔ وہ منظومات جو 1880ء سے 1914ء کے درمیان رکھی گئیں آٹھویں نمبر پر ہیں۔ اس کے بعد مدحیہ قصائد، قطعات، شخصی مرثیے، بچوں کے لیے نظمیں، تراجم و متفرقات، تاریخ گوئی، فارسی کلام اور عربی کلام کو جگہ دی گئی ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی اُردو ادب کی واحد تخلیقی شخصیت ہیں جو شاعری اور نثر دونوں میں یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ شاعری میں جدید شاعری، جدید غزل اور جدید نظم کا آغاز کرنے والے تصور کیے جاتے ہیں تو نثر میں سوانح نگاری اور جدید تنقید میں بھی اولیت کا سہرا ان کے سر بندھتا ہے۔ خواجہ محمد زکریا

نے اس کی کلیاتِ شعری کی ترتیب و تدوین کر کے یقیناً ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ جس کے لیے وہ بجا طور پر داد کے مستحق ہیں۔

بلاشبہ خواجہ محمد زکریا کی دلچسپی کا زیادہ تر موضوع اُردو شاعری ہی ہے اور انھوں نے اُردو کے پانچ نہایت اہم شاعروں کے کلیات مرتب کیے ہیں جبکہ چھٹے شاعر اکبر الہ آبادی کے کلیات کی ترتیب و تدوین جاری ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا تدوینی کام صرف شاعری تک ہی محدود ہے۔ انھوں نے نثر کی تدوین بھی کی ہے جس کی سب سے اہم مثال "نثرِ اکبر الہ آبادی" ہے۔ اکبر الہ آبادی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا نہایت اعلیٰ قدر و قیمت کا مقالہ لکھ کر۔ نثرِ اکبر الہ آبادی کو ترتیب دے کر اور اب "کلیاتِ اکبر الہ آبادی" کی ترتیب و تدوین کا بیڑہ اٹھا کر خواجہ محمد زکریا نے اُردو زبان و ادب کے اس نابغہ روزگار شخصیت کو اُردو ادب میں حیاتِ نو دینے کی کوشش کی ہے اور میرا خیال ہے کہ کلیات کی اشاعت کے بعد ایک بار پھر سے اکبر الہ آبادی کے حوالے سے تنقیدی مباحث کا آغاز ہوگا۔

جہاں تک اکبر الہ آبادی کی نثر کا تعلق ہے تو یہ نہایت مختصر کام ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے اکبر کی نثر کو جمع کرنے کا کام تو تب ہی شروع کر دیا تھا جب وہ اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کر رہے تھے مگر اسے باقاعدہ مرتب کر کے چھپانے کی نوبت 2008ء میں آئی۔ اس میں اکبر کے بیالیس مضامین اور پانچ ادبی مجموعوں کے بارے میں تاثرات شامل ہیں۔ اپنے پیش لفظ میں خواجہ محمد زکریا اپنے کام کا تعارف اس طرح کرواتے ہیں:

"اکبر الہ آبادی کے یہ مضامین اور ادبی کتابوں پر تاثرات مختلف ذرائع سے اکٹھے کر کے پہلی بار ایک مجموعے کی شکل میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین اودھ پنچ لکھنو کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ مضامین کے آخر میں ایک روداد شامل ہے جو اودھ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد ادبی کتابوں پر چند تاثراتی تحریریں ہیں۔ لیکن مجموعے کا غالب حصہ "اودھ پنچ" میں شائع شدہ مضامین پر مشتمل ہے۔" (۳۳)

خواجہ محمد زکریا نے اکبر الہ آبادی کی جن تحریروں کو یہاں جمع کیا ہے اُن کی زیادہ تر اہمیت تو یہ ہے کہ وہ اکبر کی تصنیف کردہ ہیں اور ان کی بعض دلچسپیوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ اکبر کے مضامین میں موجود نثر، قدیم اُردو نثر اور جدید اُردو نثر کا سنگم معلوم ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ وہ دونوں کے لیے اپنے اندر کشش محسوس کرتے ہیں۔ اکبر کی نثر کے حوالے سے خواجہ محمد زکریا نے اپنے مقالے میں یوں اظہارِ خیال کر رکھا ہے۔

"اکبر کی نثر کے مختلف رنگ ہیں۔ کہیں قدیم انداز میں قافیہ پیمائی، لفظی رعایتیں اور ہم وزن نثری ٹکڑے، کہیں بے قافیہ، رواں اور سیدھی سادی نثر تاہم اس نثر کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ نہ تو حالی کی نثر جیسی سادہ اور نہ سرور وغیرہ کی طرح رنگین۔" (۳۳)

نثر میں اکبر الہ آبادی کے خطوط کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے اپنے مقالے میں اکبر کے ایک ترجمے کی نشاندہی بھی کی تھی۔ اس ترجمے کے آغاز میں اکبر نے ایک "تمہید" بھی تحریر کی تھی۔ ترجمہ عرصے سے نایاب ہے۔ اس لیے "تمہید" تک رسائی بھی ممکن نہیں۔ اگر اکبر کی لکھی اصل "تمہید" بھی "نثر اکبر الہ آبادی" کا حصہ بن جاتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

خواجہ محمد زکریا ایک حقیقی محقق، ادیب اور اردو ادب کے قاری ہیں۔ وہ خالص فنی اور لسانی بنیادوں پر تحریر کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ جو لکھنے والے انھیں پسند آتے ہیں ان کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں اور جو لکھنے والے انھیں پسند نہیں آتے ان کے بارے میں بھی اپنے خیالات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ خواجہ محمد زکریا کی شخصیت میں ایک اہم عنصر یہ ہے کہ وہ نہ تو خود ناانصافی کرتے ہیں نا کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتی برداشت کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو حق و انصاف کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ عملی زندگی میں بھی دکھائی دیتا ہے اور علمی معاملات میں بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے "کلیات مجید امجد" کی ترتیب و تدوین کر کے انھیں جدید اردو شاعری میں ان کا مقام دلوانے کی کامیاب کوشش کی۔ جب دیکھا کہ لوگ حفیظ جالندھری کو بھولنے لگے ہیں تو ان کے کلیات کی تدوین کر کے اس تک قارئین کی بہتر رسائی کو ممکن بنایا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ محمود نظامی اور ان کے شاندار سفرنامے "نظرنامہ" کے ساتھ بھی ہے۔

محمود نظامی کا شمار اردو کے اعلیٰ درجے کے لکھنے والے گمنام ادیبوں میں ہوتا ہے ان کا سفرنامہ 1958ء میں پہلی بار شائع ہوا اور اس کا چرچا بھی ہوا لیکن محمود نظامی کی جواں مرگی نے انھیں جلد ہی لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ وہ اپنے دور کے نہایت اہم شعرا و ادبا، جیسے قیوم نظر، اشفاق احمد، ممتاز مفتی اور اعجاز حسین بٹالوی وغیرہ کے قریبی دوست مانے جاتے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق لاہور کے ممبر اور حلقے کی ادبی نشستوں میں شامل ہونے والے افراد تھے ان کے سفرنامے کا کافی بڑا حصہ "حلقہ ارباب ذوق لاہور" کے ادبی مجلہ "نئی تحریریں" میں شائع بھی ہوتا رہا۔ اس کے باوجود آنکھیں موندتے ہی محمود نظامی کو فراموش کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ خواجہ محمد زکریا نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہ "نظر

نامہ" اُردو کے اہم ترین سفرناموں میں شامل ہے اور اس پر وقت کی اتنی گرد نہ پڑ جائے کہ لوگوں کے حافظے سے محو ہو جائے اس کی تصحیح متن کی۔ اس پر حواشی تحریر کیے اور ایک طویل مقدمے میں محمود نظامی کے حالات زندگی اور فنی خصوصیات قلمبند کی۔ اپنے دیباچے میں وہ "نظر نامہ" کی تازہ اشاعت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"اس کی اشاعت شایانِ شان انداز میں نہیں کی گئی تھی اور اس میں اغلاط کی بھرمار تھی۔ اب میں نے درستی اغلاط کی اپنی سی سعی کی ہے۔ "نظر نامہ" کا بڑا حصہ حلقۂ اربابِ ذوق کے مجلّے "نئی تحریریں" میں دو اقساط میں شائع ہوا تھا۔ جس کا متن مطبوعہ کتاب سے بہتر ہے۔ تصحیح متن میں ان اقساط سے تقابل کر کے کئی الفاظ اور جملے درست کر دیے ہیں۔ مطبوعہ کتاب میں بعض جملے حذف کر دیے گئے تھے۔ جن سے ربط قائم نہیں رہا تھا، وہ جملے حسبِ موقع ایزاد کر دیے ہیں۔ بعض اوقات دونوں جگہ متن میں غلطیاں دکھائی دیں ان کی قیاسی تصحیح کر دی ہے اور فٹ نوٹ میں ان مقامات پر نشان دہی کر دی ہے۔ کہیں یورپی زبانوں کے الفاظ کی صحت کے لیے لغات سے بھی مدد لینی پڑی۔ فٹ نوٹ میں ایسے مقامات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔"(۳۵)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خواجہ محمد زکریا نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے تصحیح متن کے عمل کی وضاحت کی ہے۔ اس سے ہمیں نہ صرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ نثری متن انھوں نے کیسے مرتب کیا۔ کن کن باتوں کا خیال رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی سیکھ سکتے ہیں کہ اگر ہم نے ایک اچھا نثری متن مرتب کرنا ہو اس کی تصحیح کرنا ہو اور اس پر حواشی لکھنا تو ہمیں کن کن باتوں کا خیال رکھنا ہوگا ہمارے عہد میں وہ لوگ جو ایسے ہی اتنی سنجیدگی سے کام کرتے ہیں اور اپنے بعد آنے والے لوگوں کو رہنمائی مہیا کرتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا شمار بلاشبہ ایسے ہی چیدہ لوگوں میں ہوتا ہے۔

خواجہ محمد زکریا کی تحقیق کے عنوان سے ہم نے ان کی تحقیقی کتب، ان کے مرتب کردہ شعری کلیات اور نثری کتب کا جائزہ لیا ہے۔ ہم بطور محقق ان کے کام کے حوالے سے بلا خوف تردید یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ وہ ایک باریک بین اور سخت محنت کرنے والے فرد ہیں۔ کلاسیکی شعریات، تدوین متن اور تصحیح متن کی مبادیات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ہر متن کو اس کے تقاضوں کے مطابق مرتب کرتے ہیں۔ اپنے کام پر نظرثانی کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور اسے بہتر سے بہتر بنا کر درجہ کمال تک پہنچانے کی سعی کرتے ہیں۔ یہ خوبیاں ہمارے دور میں تو خال خال لکھنے والوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

حواشی

۱۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ: "اردو میں قطعہ نگاری" ضیائے ادب، لاہور، س ن، ص ۲
۲۔ ایضاً، ص: ج
۳۔ ایضاً، ص: ب
۴۔ ایضاً، ص: ۳۰
۵۔ ایضاً، ص: ۲۲ـ۱۲۸
۶۔ ایضاً، ص: ۲۸ـ۱۳۹
۷۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ: گیراں آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2003ء، ص: 105
۸۔ ایضاً، ص: 108
۹۔ ایضاً، ص: 109
۱۰۔ ایضاً، ص: 193
۱۱۔ ایضاً، ص: 196
۱۲۔ ایضاً، ص: 201
۱۳۔ ایضاً، ص: 234
۱۴۔ ایضاً، ص: 263
۱۵۔ ایضاً، ص: 273
۱۶۔ ایضاً، ص: 309
۱۷۔ ایضاً، ص: 348
۱۸۔ ...الدین صدیقی محمد ... پیش لفظ مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند (طبع دوم)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء، جلد اول
۱۹۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، پیش لفظ مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (طبع دوم)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جلد ششم ۲۰۱۲ء
۲۰۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تاریخیں
۲۱۔ محمد زکریا خواجہ (مدیر)، مختصر تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند: اردو ادب آغاز تا بیسویں صدی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۶ء، پیش لفظ، ص: الف
۲۲۔ ایضاً، ص: الف
۲۳۔ ایضاً، ص: الف
۲۴۔ خالد شریف، کلیاتِ مجید امجد (مرتبہ خواجہ محمد زکریا) اشاعت اول، ماورا پبلشرز لاہور، 1988ء، ص:

باب سوم

خواجہ محمد زکریا کی تنقید نگاری

خواجہ محمد زکریا کے تحقیقی کام کے بعد ہم ان کے تنقیدی کام کی طرف آتے ہیں۔ اس بات کو یاد رکھیں کہ ان کے کام میں تحقیق اور تنقید کی حدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ وہ اپنے تحقیقی مقالات میں بھی تنقیدی شعور سے کام لیتے ہیں اور اپنے تنقیدی مضامین میں تحقیق سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے چوں کہ زندگی بھر اردو زبان و ادب پڑھایا ہے اس لیے ان کی بہت گہری دلچسپی اردو ادب کے تدریسی پہلو سے ہے۔ انھوں نے اپنے بیشتر مضامین کے لیے جن شعرا و ادبا کا انتخاب کیا ہے وہ داخل نصاب رہے ہیں۔ انھیں ہم مدرس نقاد کہہ سکتے ہیں مگر تحقیقی متنوں میں ان کی تنقید پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تنقید کے کلاسیکل تصور اور ماڈل کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جس میں نقاد کی دلچسپی کا مرکزی موضوع شعری اور تخلیقی متن ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تخلیق کار کی زندگی اور شخصیت کا بھی حوالہ بنایا جاتا ہے۔ تخلیق کار کے عصر کو بھی سامنے رکھا جاتا لیکن اتنا ہی جتنا متن کی تفہیم کے لیے ضروری ہو۔

خواجہ محمد زکریا کی تنقید نگاری کا آغاز 1960ء کی دہائی میں ہوا اور ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "نئے پرانے خیالات" 1970ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل بارہ مضامین شامل تھے اور اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحریر کیا تھا۔ اس سے پیشتر ان کی ایک تحقیقی تنقیدی کتاب "اردو کی قدیم اصناف شعر" شائع ہو چکی تھی۔ اس کتاب پر سن اشاعت تو درج نہیں ہے لیکن خواجہ صاحب کے اپنے تحریر کردہ دیباچے کے آخر میں "لیکچرار اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ۔ ۱۹۶۷-۱-۳ درج ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی ہوگی۔ اس کتاب میں پانچ مضامین کو مصنف نے تنقید کی ذیل میں رکھا ہے۔ خواجہ محمد زکریا کی تنقید نگاری پر اپنی بات کا آغاز ہم انھی مضامین سے کریں گے۔

پہلا تنقیدی مضمون "اردو قصیدہ" ہے جس میں خواجہ محمد زکریا نے اردو شاعری کی اس قدیم صنف کو جس میں مدحیہ شاعری ہوتی ہے اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے خیال میں "اردو قصیدہ" کا آغاز دکن سے

ہوتا ہے اور بقول ان کے عہد بہمنی کی ایک مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" جو کہ نظامی بیدری کی تخلیق ہے کے آغاز میں سلطان علاالدین بہمنی کی مدح میں لکھے گئے شعر کو ہم اُردو قصیدہ کے ابتدائی نقوش قرار دے سکتے ہیں۔ خواجہ محمد ذکریا قصیدہ اور مثنوی کے فرق کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لیے وہ نظامی کو پہلا مدح گو شاعر کہتے ہیں اور بہمنی دور کے آخر کے ایک شاعر مشتاق کو اُردو کا پہلا قصیدہ گو قرار دیتے ہیں۔ اپنے زیرِ نظر مختصر مضمون میں وہ اُردو قصیدہ کی روایت کو نہایت اجمال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہ دکن کے قصیدہ گو شاعروں سے شروع کر کے اساتذہ و متاخرین میں محسن کاکوروی، امیر مینائی، داغ دہلوی، جلال، سائل اور ضمیر تک آتے ہیں۔

اس سے آگے "سودا کی قصیدہ نگاری" میں انھوں نے فنِ قصیدہ نگاری کے رموز کی نشاندہی کرتے ہوئے سودا کے قصیدوں کا فنی جائزہ لیا ہے۔ بقول خواجہ صاحب سودا اس لیے اُردو کے اہم ترین قصیدہ نگار ہیں کہ ان کا مزاج صنفِ قصیدہ کے فنی پہلوؤں سے مناسبت رکھتا تھا۔ اپنے مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ:

"قصیدے کا پہلا جز تشبیب یا نسیب ہے۔ تشبیب حدیثِ شباب کے بیان کو کہتے ہیں۔ عربی قصائد میں یوں کہ آغازِ قصیدہ میں عشقیہ اشعار ہوتے ہیں اس لیے اسے تشبیب کہا جاتا تھا۔ نسیب غزل کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے عشق و محبت کے شخصی اور ذاتی واردات کا بیان۔ اس کے برخلاف تشبیب محض رسمی طور پر عشقیہ اشعار کہنا ہے۔ اس میں غزل کا سا خلوص ہونا ضروری نہیں۔(۱)

اسی طرح وہ ایک ایک کر کے قصیدہ کے مختلف فنی رموز کی وضاحت کرتے جاتے ہیں۔ تشبیب کے بعد گُریز یا گریز، اور پھر مدح کی طرف آتے ہیں۔ اور آخر میں سودا کی قصیدہ نگاری کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے کا بیان یوں کرتے ہیں۔

"غرض تعداد اور معیار کے لحاظ سے سودا کے قصیدے اُردو کے بہترین قصیدے ہیں۔ قصیدہ کے لیے جب ہم معیار کا ذکر کرتے ہیں تو شاعری کے بین الاقوامی معیار ہمارے ذہن میں نہیں ہوتے۔ بلکہ فنِ قصیدہ نگاری جس طرح ایران اور ہندو پاکستان میں رائج رہا، ہمارے مدِ نظر ہوتا ہے۔ ان معیاروں پر پرکھیں تو سودا کو نہ صرف اُردو کا عظیم قصیدہ نگار ماننا پڑتا ہے بلکہ ایران کے بڑے بڑے قصیدہ نگاروں کا مد مقابل بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔"(۲)

اس سے متصل "تجزیات" سے اور پھر "غالب کے قصائد" پر بھی بات کی گئی ہے۔ غالب نے اُردو میں چار قصیدے تحریر کیے ہیں۔ خواجہ صاحب غالب کی قصیدہ نگاری کی نمایاں خصوصیت ان کا آسان

زمینوں میں لکھا جانا بتاتے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ غالب کے قصاید فنِ قصیدہ نگاری پر پورا نہیں اترتے تھیں وہ اس بات پر غالب کی ستائش کرتے ہیں کہ ان کے قصاید کی تشبیب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کی داد بھی غالب کو دیتے ہیں کہ وہ گریز کا مرحلہ بھی فن کاری سے طے کرتے ہیں۔ مدح جو قصیدہ میں سب سے اہم سمجھا جاتا ہے، اس میں غالب کمزور پڑتے ہیں اس کی شاید وجہ ان کے مزاج کی انانیت ہے۔ خواجہ ذکریا غالب کے قصاید کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے رائے دیتے ہیں کہ:

"غالب اُردو کے بہت بڑے قصیدہ نگار نہ سہی، پھر بھی یہ چاروں قصیدے اپنی بعض خصوصیات کی بناء پر لائق توجہ ضرور ہیں۔"(۳)

اب ہم آتے ہیں "ہجویات" والے حصے کی جانب۔ یہ قصیدہ کے بالکل الٹ ہے اس میں کسی شخص کی مذمت کی جاتی ہے۔ جو شخص بھی ہو سکتی ہے اور گروہ بھی۔ خواجہ محمد ذکریا نے بہت درست کہا ہے کہ اگر کسی شہر کی ہجو لکھی جائے تو اسے شہر آشوب اور اگر ساری دنیا کی ہجو لکھی جائے تو اسے جہاں آشوب کہا جاتا ہے۔ اُردو زبان و ادب کا تشکیلی دور، ناساعد حالات سے پُر تھا۔ معاشرہ شکست و ریخت کا شکار تھا۔ سیاسی نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ فرد اور معاشرے کے تعلق میں دراڑ پڑ رہی تھی۔ ایسا عہد ہجو کے لیے نہایت سازگار حالات پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اٹھارویں صدی میں ہمیں ہجویات اور شہر آشوب بڑی تعداد میں اُردو میں تخلیق ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ "ہجویات" کے باب میں زیادہ تر بات سودا کی ہجویات پر کی گئی ہے۔ یہ مختصر مضمون ہمیں کئی اعتبار سے تشنہ محسوس ہوتا ہے۔

اس کتاب میں شامل دوسرا مضمون "اُردو مرثیہ" قدرے طویل اور تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مرثیہ کے بارے میں عمومی باتیں کی گئی ہیں۔ دوسرے حصے میں مرثیہ نگاری کے فن پر بات ہے اور تیسرے حصے میں پھر انیس کی مرثیہ نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خواجہ ذکریا نے اُردو مرثیے کی مختصر تاریخ رقم کرتے ہوئے ضمیر اور ان کے معاصرین کو یہ اعزاز دیا ہے کہ انھوں نے مرثیے کی ظاہری شکل متعین کر دی تھی اور اسے لکھنو کے تہذیبی احوال کے مطابق بنا دیا تھا۔ اس لیے بعد میں آنے والے اہم ترین مرثیہ گو شاعروں میں میر انیس اور مرزا دبیر کو مرثیے کی ظاہری شکل میں کسی تبدیلی کی صورت محسوس نہیں ہوئی۔

"مرثیہ نگاری کا فن" پر بات کا آغاز کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"مرثیہ کے لیے شروع میں کسی ظاہری ہیئت کی پابندی نہ تھی۔ چناں چہ کبھی ابیات، کبھی غزل، کبھی ترجیع بند، کبھی ترکیب بند، کبھی مثلث، کبھی مربع، کبھی مسدس اور کبھی مخمس کی ہیئت میں مرثیے کہے جاتے تھے۔ مگر بعد میں مسدس کچھ ایسی مطبوع طبع ہوئی کہ دوسری تمام ہیئتیں متروک ہو گئیں اور صرف یہ ہیئت اختیار کر لی گئی۔"(۴)

خواجہ محمد زکریا بجا طور پر اپنے مضمون میں مرثیہ نگاری کے اہم اجزا کی جانب اشارہ کرتے ہیں ان کے خیال میں واقعہ نگاری، کردار نگاری، رونے رلانے کے مضامین اخلاقی درس اور اچھی زبان و بیان مرثیہ نگاری کے اہم اجزا ہیں۔ مرثیہ نگاری کے مندرجہ بالا اجزا کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ میر انیس کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میر انیس کو ان کے کمال فن کی وجہ سے اردو کا سب سے بڑا مرثیہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ جہاں تک واقعات وغیرہ کا تعلق ہے یہ کوئی انیس سے مخصوص نہیں بلکہ ان سے پہلے کے مرثیہ نگاروں میں بھی تقریباً اسی صورت میں موجود ہیں۔ کمال فن سے مراد یہ ہے کہ اعلیٰ مرثیے کے لیے جن جن خصوصیات کی نشاندہی کی جاتی ہے وہ سب انیس کے کلام میں موجود ہیں۔"(۵)

خواجہ محمد زکریا نے نہ صرف میر انیس کے مراثی کی فنی محاسن پر بات کی ہے اور ان کی فنی مہارت کو دریافت کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے میر انیس کی فکری انفرادیت کو بھی ابھارا ہے۔ خاص طور پر انسانی نفسیات کے حوالے سے انیس کی شاعری میں موجود نکات کی جانب بلیغ اشارے کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جذبات کے اظہار میں بعض جگہ انیس نے بڑی قدرت کلام اور نفسیات انسانی سے واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ جذبہ بعض اوقات تیز اور شدید ہوتا ہے اور بعض اوقات خفیف۔ پھر شدید اور خفیف جذبات کے درمیان بھی ہر طرح کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ جذبات کے ان مدارج کو ملحوظ رکھنا اور ان کا اظہار کرنا انیس کا ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی دوسرا مرثیہ نگار ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے مختلف مرثیوں میں ایک ہی موقعے پر ایک ہی شخص کے مختلف بلکہ متضاد جذبات دکھائے ہیں اور ہر جگہ حالات میں کچھ ایسا تحتی تغیر کر دیا ہے کہ جذبات فطرت کے مطابق ہی رہے ہیں۔"(۶)

مندرجہ بالا اقتباس کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ خواجہ محمد زکریا کس باریک بینی سے شاعری کا مطالعہ کرتے اور اس میں چھپے نکات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواجہ محمد

زکریا کی فنی معاملات پر گرفت کی تعریف تو اکثر کی جاتی ہے لیکن ان کی تحریروں کے مطالعہ سے قاری جان جاتا ہے کہ انھیں فکری معاملات کو سمجھنے میں بھی دسترس ہے۔

اس کتاب میں شامل تیسرا تنقیدی مضمون ''نظیر اکبرآبادی'' میرے خیال میں خواجہ محمد زکریا کے بہترین تنقیدی مضامین میں شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نظیر اکبرآبادی کی تفہیم پر لکھے جانے والے اہم تنقیدی مضامین میں شامل ہے۔ نظیر اکبرآبادی اس اعتبار سے بھی ایک منفرد شاعر ہے کہ اس کے معاصرین نے اس کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کی غزلیات کو بھی نہیں جو بلا شبہ اس کے عہد کے کسی بھی اہم ترین شاعر کی غزلیوں سے کم اچھی نہیں ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ نظیر کا عوامی لب ولہجہ اور عام آدمی کی زندگی کا بیان ہے جسے اس کے عہد کے شاعر اور تذکرہ نگار شاعری ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب حالات میں تبدیلی آئی، زندگی کی اقدار بدلیں، ادب وفن کے روایتی معیارات پر سوالات اٹھائے گئے اور ''نئی شاعری'' اور فطرت نگاری کا چلن عام ہونے لگا تو رفتہ رفتہ نظیر اکبرآبادی کی شاعرانہ حیثیت کا بھی اعتراف کیا جانے لگا۔

خواجہ محمد زکریا نے ''نظیر اکبرآبادی'' تحریر کرتے ہوئے ابتدائی تذکرہ نگاروں سے لے کر حالی اور شبلی جیسے ناقدین کی بے اعتنائی کا اقرار کرتے ہوئے نظیر اکبرآبادی کی شاعری کو سمجھنے اور ان کے فنی کمالات کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے نظیر کی شاعری پر بھگتی تحریک کے اثرات، نظیر کی عوامی زبان اور بول چال، نظیر کے وسیع اور متنوع ذخیرہ الفاظ، نظیر کی حقیقت پسندی، اس کی منظر کشی، اس کی شاعری میں مقامی رنگ وغیرہ کا حوالہ دیتے ہوئے نظیر اکبرآبادی کے نظم کے سانچے برتنے کے قرینے تک پر بات کی ہے اور یوں انھوں نے نظیر کی نظموں کا نہایت مضبوط تجزیہ کیا ہے۔ وہ نظیر کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے اس کی فنی خامی کی جانب اشارہ بھی کر جاتے ہیں:

''نظیر کی نظمیں اپنی تمام خصوصیات کی وجہ سے آج بھی لائقِ توجہ ہیں۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ''تعمیری وحدت'' ان کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتی تھی۔''(۷)

زیرِ نظر کتاب میں شامل چوتھا مضمون ''رباعیات'' رباعی کے فن اور اُردو، فارسی رباعیات کے جائزہ پر ہے۔ رباعی قدیم اُردو کی وہ شعری صنف ہے جس میں شاعر پر سب سے زیادہ فنی اور ہیئتی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ رباعی کے فنی تقاضوں کے بارے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں کہ:

''یہ بات تو طے ہوئی کہ رباعی دو بیتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت ترتیب قوافی

ہے۔ رباعی کا پہلا شعر غزل کے مطلع کی طرح ہوتا ہے یعنی دونوں مصرعے ہم قافیہ، ہم ردیف (یا صرف ہم قافیہ) ہوتے ہیں۔ دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ بالعموم آزاد اور دوسرا مصرعہ پہلے دونوں مصرعوں سے ہم قافیہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات چاروں مصرعے قافیوں کے پابند نہیں ہوتے ہیں۔ ایسی رباعی کو مصرع کہتے ہیں اور جس رباعی کا تیسرا مصرعہ بے قافیہ ہوتا ہے اسے خصی۔" (۸)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خواجہ صاحب نے کس خوبی اور اختصار سے ایک مشکل صنف کے خد و خال واضح کیے ہیں۔ ایسا اس لیے ممکن ہوا کہ نقاد کثیر المطالعہ ہے اور اس کے اپنے ذہن میں باتیں بالکل واضح ہیں اس لیے وہ جب انھیں صفحات پر اتارتا ہے تو وہ بالکل واضح ہوتی ہیں۔ وہ رباعی کے فن کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"رباعی مختصر صنف سخن ہے۔ چار مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے فرد کے مقابلے میں مضمون کسی قدر وسیع ہوتا ہے مگر زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وضاحت سے زیادہ کنایہ کا استعمال بہتر ہے۔ چاروں مصرعے رباعی کے ارتکاز میں نہایت اہم ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مصرعہ ہلکا ہو، بے کار یا بھرتی کا ہو تو تمام رباعی بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس لیے چاروں مصرعوں کا ارتقا بھی ہونا چاہیے۔" (۹)

اردو رباعی کے سفر پر اجمالی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ اردو کے کلاسیکی شعرا میں میر درد کو رباعی کے اہم شاعر کے طور پر شناخت کرتے ہیں اور "کاشف الحقائق" کے مصنف امداد امام اثر کے حوالے سے کہتے ہیں کہ میر درد کو رباعی نگاری کا فطری ملکہ حاصل تھا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب الطاف حسین حالی اور اکبر آبادی کی رباعی نگاری کی تعریف کرتے ہیں۔ الطاف حسین حالی کی رباعی نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ حالی نے اپنی شاعری کو دورِ جدید اور دورِ قدیم میں تقسیم کیا ہے۔ حالی نے کل 106 رباعیات تخلیق کی ہیں۔ ان میں سے سات دورِ قدیم کے حوالے سے یادگار ہیں جبکہ ۹۹ رباعیات کا تعلق دورِ جدید سے ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حالی نے اپنے دورِ جدید میں، جس میں وہ شاعری کو قوم کی اصلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، رباعی کے فن کی طرف زیادہ توجہ دی۔ خواجہ صاحب حالی کی قدیم رباعیات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اول تو قدیم رباعیاں تعداد میں صرف سات ہیں۔ اتنی کم تعداد کی وجہ سے انھیں ادب میں کوئی بلند مقام دینا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ پھر ان سات رباعیوں میں سے بھی صحیح طور پر قابلِ التفات صرف تین رباعیاں ہیں اور تینوں عشقیہ شاعری کی ذیل میں آتی ہیں۔" (۱۰)

یہاں خواجہ محمد زکریا بعض نقادوں کے اس خیال کی تردید کر رہے ہیں جو اس بات کو اجاگر کرتے رہے کہ حالی کی قدیم رباعیات ان کی جدید رباعیات سے بہتر ہیں۔ خواجہ صاحب بالکل درست نشاندہی کرتے ہیں کہ اس غلط فہمی کا ارتکاب اس لیے ہوا چوں کہ عمومی طور پر اور بجا انداز میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حالی کی قدیم غزلیات ان کی جدید غزلیات سے بہتر ہیں۔ یوں خواجہ محمد زکریا اپنی تنقید میں صرف زیر نظر تخلیقات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں ضروری ہو رائج الوقت تنقیدی غلط فہمی کا ازالہ بھی کرتے جاتے ہیں جو بلاشبہ اچھی تنقید کا خاصہ اور اچھے نقاد کی اہم نشانی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی کی رباعیات کے حوالے سے وہ مزید لکھتے ہیں:

"حالی نے باعموم رباعی میں حسن پیدا کرنے کے لیے تین طریقے اختیار کیے ہیں۔ 1۔ مکالمہ 2۔ تقابل 3۔ تمثیل۔ مکالمے وضاحت کے لیے اہم ہیں۔ بعض جگہ ہم خیالوں کے مکالمے ہیں اور بعض جگہ مختلف الخیال لوگوں کے، جس سے تقابل میں مدد ملتی ہے۔ تمثیل حالی کا خاص انداز ہے جو نثر میں بھی آتا ہے۔"(۱۱)

مولانا الطاف حسین حالی کے بعد وہ اکبر الٰہ آبادی کی رباعیات کی جانب آتے ہیں۔ اکبر نے حالی کے مقابلے میں زیادہ رباعیات تخلیق کی ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے اس جانب واضح اشارہ کیا ہے کہ اکبر نے اردو رباعی میں بعض نئے موضوعات کا اضافہ کیا ہے۔ وہ اکبر کی رباعیات کے موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"اکبر نے اپنے خیالات کو بیان کرنے کے دو طریقے اختیار کیے۔ صاف صاف انداز میں لوگوں کو ان کی خامیوں کی طرف متوجہ کرنا اور طنز و مزاح کے ذریعے متنبہ کرنا۔ چوں کہ سرسید تحریک سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل کو زیر بحث لاتی تھی۔ اس لیے اکبر نے بھی انھی موضوعات پر اپنے انداز میں اظہار رائے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کی رباعیات میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔(۱۲)

ایسا نہیں کہ خواجہ محمد زکریا صرف اپنے ممدوح کی خوبیوں کی بیان کرتے ہیں، جہاں جہاں انھیں کوئی قابل ذکر خامی نظر آتی ہے وہ اس کی بھی نشاندہی ضرور کرتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کے رباعیات کے حوالے سے وہ عابد علی عابد کی اس بات سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ اکبر کی رباعیات میں ترنم اور شگفتگی کی کمی ہے۔

"اُردو کی قدیم اصناف شعر" میں شامل آخری مضمون "قطعات" ہے جس میں خواجہ محمد زکریا نے نہایت اختصار کے ساتھ قطعہ کی لغوی معنی سے لے کر بطور صنف اس کے عربی ادب، فارسی ادب اور اُردو ادب میں سفر کو بیان کیا ہے۔ صنف "قطعہ" کے فنی خدوخال کو نمایاں کیا ہے اور اکبر الٰہ آبادی کی قطعہ

نگاری پر خصوصی نوٹ تحریر کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں اُردو کی قدیم اصناف شعر سے چیدہ چیدہ تخلیقی پارے منتخب کیے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں پانچ تنقیدی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ یہ پانچوں مضامین پہلے حصے میں موجود شعری انتخاب کو مدِنظر رکھتے ہوئے تحریر کیے ہیں۔ یہ کتاب اصل میں خواجہ محمد زکریا کی 1964ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب "قدیم نظمیں" کی ترمیم اضافہ شدہ شکل ہے۔ یہ دونوں کتابیں اس وقت کے ایم۔اے اردو کے طلباء کی تدریسی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مرتب کی گئیں تھیں۔ زیرِ نظر کتاب میں شامل پانچ مضامین بھی طلباء کی تدریسی ضروریات کے لیے تحریر کیے گئے ہیں لیکن ان مضامین کا اصل حسن یہ ہے کہ ان سے عام قاری بھی لطف لیتا ہے اور اُردو کی قدیم اصناف شعر کے بارے میں اپنے علم میں اضافہ کر سکتا ہے۔

نئے پرانے خیالات

"نئے پرانے خیالات" کو خواجہ محمد زکریا کا پہلا باقاعدہ تنقیدی مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ مجموعہ 1971ء میں شائع ہوا اور اس کا انتساب انھوں نے اپنی "والدہ مرحومہ کے نام" کیا ہے۔ اس مجموعے میں کل بارہ مضامین شامل ہیں اور فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے والوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ خواجہ صاحب کی بنیادی دلچسپی کا موضوع اُردو شاعری ہے۔ بارہ میں سے نو مضامین شاعری کے حوالے سے ہیں، دو پریم چند کے بارے میں ہیں اور ایک ڈاکٹر محمد صادق کی "تاریخ ادب اُردو" کا محاکمہ ہے۔ اپنے تنقیدی مجموعے کے دیباچہ میں خواجہ محمد زکریا تحریر کرتے ہیں۔

"میرے تنقیدی مضامین کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے تمام مضامین گزشتہ دس برسوں میں لکھے گئے ہیں۔ قدیم ترین مضمون "دلی کا دبستانِ شاعری" ہے جو میں نے طالب علمی کے زمانے میں لکھا تھا اور آخری مضمون "سودا اور غالب" ہے جو غالب کی صد سالہ برسی کے دوران لکھے گئے ہوئے مضامین کے بحرِ ذخار میں ایک بلبلہ پانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں سے بعض مضامین تو بہت حد تک روایتی خیالات سے اخذ و استفادہ تک محدود ہیں۔ جن میں محض کہیں کہیں ذاتی تحقیق و تفحص پر تو ملتا ہے۔ مگر کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جو مروجہ تنقیدی آراء سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کتاب کا نام "نئے پرانے خیالات" رکھا ہے۔ یہاں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے مروجہ نظریات سے اختلاف محض انفرادیت کے شوقِ فضول کی بناء پر نہیں کیا بلکہ جب میرے مطالعے نے مجھے یقین دلا دیا

کہ بیشتر نقادوں کو کسی خاص رائے کے قائم کرنے میں مغالطہ ہوا اور تحقیق مزید نے ابتدائی رائے کی تصدیق کی تو میں تردید میں "خامہ فرسائی" پر مجبور ہوا۔"(۱۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں اس کتاب میں شامل مضامین کے حوالے سے بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی مضامین کے بارے میں خواجہ صاحب کی رائے بھی جاننے کا موقع ملتا ہے۔ میرے خیال میں انھوں نے جتنی صاف گوئی اور غیر جانبداری سے اپنے مضامین کا احاطہ کیا ہے تو اس کی نظیر تو ہمیں اُردو نقادوں میں خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں سکہ رائج الوقت سے انحراف کرنے کا حوصلہ موجود ہے وہ جس تخلیق یا تخلیق کار کو پڑھتے ہیں اس کے بارے میں اپنی رائے خود سے بناتے ہیں۔ خود راقم کو اُردو تنقید پڑھتے ہوئے کئی جگہ مکھی پہ مکھی مارنے کی صورت نظر آتی ہے۔ کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں ابتدائی ایک دو نقادوں نے جو کچھ لکھ دیا، بعد میں آنے والے تھوڑے بہت ردو بدل کے ساتھ دہراتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہے کہ بہت کم لوگ تخلیقات کے مطالعہ سے ان کے بارے میں آزادانہ رائے قائم کرنے اور اس رائے کا اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اپنے دیباچے میں اپنے تنقیدی طریقہ کار اور اپنی تنقیدی ترجیحات کے بارے میں بھی مختصراً اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" مجھے اُردو تنقید کے اس رجحان سے سخت نفرت ہے جس میں ہر کوئی "اچھا" نظر آتا ہے۔ میں ایسے نقادوں سے تو انھیں بہتر سمجھتا ہوں جو "سب ناقص ہے" کے مدعی ہیں۔ اس طرح مزید غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ میں ان نقادوں کے حق میں بھی "دعائے خیر" ہی کر سکتا ہوں جو ولی سے ناصر کاظمی تک ہر شاعر پر لکھتے ہوئے پانچ سات فقروں سے کام چلا لیتے ہیں اور جن کی بے شمار کتابیں قاری کے ذہن میں تجسس اور انکشاف کی ایک لہر بھی پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو تو اس سے خاموش رہنا بدرجہا بہتر ہے۔"(۱۴)

آپ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ جان جاتے ہیں کہ خواجہ محمد زکریا تنقید سے یہ مراد نہیں لیتے کہ سب اچھا ہے کی صدا لگائی جائے بلکہ وہ نقاد کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ تخلیق اور تخلیق کار کی خامیوں کی جانب بھی درست اشارہ کرے۔ یہاں وہ تخلیق کی فنی پہلوؤں کو خاص طور پر اہمیت دیتے ہیں انھوں نے نہایت لطیف انداز میں ایک نقاد کی تنقیدی کوتاہ نظری کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے نقاد کا

نام تو نہیں لکھا لیکن زیادہ امکان ہے کہ ان کا اشارہ عبادت بریلوی کی تنقید کے بارے میں ہے اور یہ بالکل درست تجزیہ ہے۔

"نئے پرانے خیالات" کا پیش لفظ خواجہ محمد زکریا کے استاد اور نامور محقق اور نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ کا تحریر کردہ ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے پیش لفظ کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"عزیز مکرم خواجہ محمد زکریا کے اس مجموعہ مضامین سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا..... انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں یا پھر ایسے ہیں جن کے بارے میں کوئی الجھن یا مغالطہ یا اختلاف رائے ہے۔"(۱۵)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے جس طرح اپنے پیش لفظ کا آغاز کیا ہے اور اپنے نوجوان شاگرد کے لفظ کو جن الفاظ میں سراہا ہے میرے خیال میں وہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے عالی ظرف ہونے اور شفیق استاد ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خواجہ محمد زکریا کے لیے بھی اعزاز کی بات ہے کہ جب ان کی عمر تیس سال تھی اور ان کی پہلی تنقیدی کتاب منظر عام پر آ رہی تھی تو اس عہد کے ایک بڑے محقق اور نقاد نے ان کے کام کی ان الفاظ میں تعریف کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے پیش لفظ کا اختتام بھی بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

"اس مجموعے کے باقی مضامین بھی چونکا دینے والے ہیں..... ان کو پڑھ کر ان کے نتائج سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن آسانی سے انھیں ٹالا نہیں جا سکتا۔ پڑھنے والا اختلاف کرنا بھی چاہے گا تو کافی محنت کرنے کے بعد۔ کافی تحقیق و کاوش کے بعد..... بہرحال میں ان مضامین سے محظوظ بھی ہوا ہوں اور مستفید بھی۔"(۱۶)

"نئے پرانے خیالات" کی فہرست مضامین پر ایک نگاہ ڈالتے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ خواجہ محمد زکریا کی دلچسپی کا محور اردو شاعری ہے اور اس میں بھی وہ زیادہ تر کلاسیکی شاعروں کو اپنی تنقید کا موضوع بناتے ہیں۔ اس میں جوش ملیح آبادی ایک استثناء دکھائی دیتے ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون "نظیر اکبر آبادی" ہے جو ان کی کتاب "اردو کی قدیم اصناف شعر" میں بھی شامل ہے جس پر ہم اوپر بات کر آئے ہیں۔ جبکہ اس میں شامل اقبال کے حوالے سے تین مضامین بعد میں ان کی کتاب "اقبالیات: چند نئی جہات" کا حصہ بنے۔ ان پر بات اس باب کے دوسرے حصے میں ہوگی۔

خواجہ محمد زکریا نے اپنے مضمون "سودا اور غالب" کے حوالے سے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ یہ مضمون

غالب کی صد سالہ برسی کے دوران لکھا گیا۔ یوں یہ سب سے تازہ مضمون بھی تھا جو زیرِ نظر کتاب میں شامل ہوا۔ اس مضمون میں خواجہ محمد زکریا نے غالب کی سودا کی شاعری سے دلچسپی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ سودا اور غالب کی فکری اور شعری رشتوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غالب اپنے خطوط میں کئی جگہ سودا کے اشعار کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہاں وہ خاص طور پر مرزا تفتہ کے نام ایک خط کا حوالہ دیتے ہیں جس میں غالب سودا کا شعر اپنے شعر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ سودا اور غالب کے کلام میں پائی جانے والی مماثلتوں کے حوالے سے خواجہ محمد زکریا درج ذیل درست نتیجہ نکالتے ہیں:

"سودا اور غالب کے کلام میں بہت سی خصوصیات ملتی جلتی نظر آتی ہیں جس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ دونوں بیدل کے مداح ہیں اور بیدل کی اکثر علامتیں دونوں میں موجود ہیں۔ غبار۔ آبلہ۔ رفتار۔ برق۔ صندل۔ بیاباں۔ آئینہ۔ ساحل۔ تشنگی۔ سراب۔ موج۔ محیط اور اس طرح کے بے شمار الفاظ اور تراکیب کے اشتراک کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔"

"غالب اور سودا کی مماثلت کا دوسرا بڑا سبب دونوں کا ہم مزاج ہونا ہے۔ دونوں کو ورثے میں انانیت، احساس تفاخر، بے جا یا بجا اکڑ اور امارت کی خوبیاں ملی تھیں۔ سودا اپنے زمانے کے اساتذہ کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے۔ غالب کی رائے بھی اپنے معاصرین کے بارے میں اچھی نہ تھی۔ بے اولادی کا غم بھی دونوں کے ہاں موجود ہے۔" (۱۷)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خواجہ محمد زکریا سودا اور غالب کا تقابل کرتے ہوئے ان کے فنی اور فکری دونوں پہلوؤں پر بات کرتے ہیں۔ دونوں شاعروں کی علامتوں کے پس منظر میں بیدل کے اثرات کی جانب اشارہ کرنے کے بعد، دونوں کے مزاج، دونوں کے حالات اور ہم عصر لکھنے والوں کی جانب دونوں کے طرزِ عمل میں اشتراکات دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سودا کی زمینوں میں غالب کی غزلیات کی طرف آتے ہیں جو ایک سطح پر غالب کی جانب سے سودا کی شعری عظمت کا اقرار ہے۔ دوسرا وہ غالب کے اشعار اور سودا کے اشعار کا تقابل کر کے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ غالب کے بعض اردو اشعار کے ابتدائی نقوش میں سودا کی شاعری کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کس دقتِ نظر سے دونوں شاعروں کی شاعری کو پڑھا اور سمجھا ہے۔ "سودا اور غالب" کو ہم تقابلی تنقید کی ایک اچھی مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا کی تنقید میں تقابلی تنقید کے اور بھی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ان میں ایک مضمون "حالی

اور شفیتہ" بھی ہے۔ حالی اور شفیتہ ہم عصر تھے۔ اس فرق کے ساتھ کہ شفیتہ سینئر تھے اور کلاسیکی شعر و ادب میں رچے بسے۔ ان کا تذکرہ اُردو کے نمایاں تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ اپنے زیرِ نظر مضمون میں خواجہ محمد زکریا نے اس رائے کا اعلان کیا ہے کہ "حالی کو حالی شفیتہ نے بنایا۔ وہ بتاتے ہیں کہ اس رائے کی تعبیر کا آغاز رام بابو سکسینہ کی "تاریخ ادب اُردو" سے ہوا اور مولانا صلاح الدین احمد جیسے افراد نے اسے آگے بڑھایا۔ خواجہ صاحب اپنے زیرِ نظر مضمون میں شفیتہ اور حالی کے تنقیدی تصورات کا موازنہ کرتے ہوئے بالکل درست نشاندہی کرتے ہیں کہ شفیتہ کے ہاں کوئی نظامِ تنقید موجود نہیں اگرچہ وہ اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ ان کا تذکرہ "گلشن بے خار" اُردو کا پہلا معیاری تذکرہ ہے۔ ہم پہلے بھی ذکر کر آئے ہیں کہ خواجہ محمد زکریا اپنی تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ زیرِ مطالعہ فن پارے یا تخلیق کار کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی نشاندہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں وہ شفیتہ اور حالی کے درمیان موجود اختلافات کی جانب بڑی صراحت سے اشارہ کرتے ہیں۔

"جن لوگوں نے حالی کی کتابوں کا سرسری نظر سے بھی مطالعہ کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ حالی کا مذاقِ شعر شفیتہ سے یکسر مختلف ہے۔ اس کی وجہ بیان کی جا چکی ہے یعنی یہ کہ شفیتہ کی ذہنی تربیت پرانے ماحول میں ہوئی چنانچہ انھوں نے روایتی مذاقِ شعر کو اپنایا۔ حالی اس دور میں پلے بڑھے جس میں اجتماعیت کا شعور بیدار ہو رہا تھا۔ حالی اور شفیتہ کے مزاجوں کے درمیان ۱۸۵۷ء کی دیوار حائل ہے۔ اس وقت حالی کی عمر صرف بیس سال یک تھی۔ یہ کوئی ایسی پختہ عمر نہیں ہے۔ بعد میں جو بعض اجتماعی تحریکیں شروع ہوئیں انھوں نے حالی کے پرانے مذاقِ شاعری کو بالکل بدل دیا۔ حالی کی تمام کتابیں شفیتہ کی وفات کے بہت بعد میں شائع ہوئیں۔ (۱۸)

"جوش کی نظم نگاری" جوش کی نظموں کا فنی تجزیہ ہے۔ وہ بجا طور پر اپنے مضمون میں کہتے ہیں کہ اُردو میں دو طرح کے نقاد ہیں۔ پہلی طرح کے نقاد تخلیق کے موضوع سے سروکار رکھتے ہیں اور موضوع ہی کی بنیاد پر فن پارے کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں جبکہ دوسری طرح کے نقاد سب سے پہلے فن پارے کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو پرکھتے ہیں۔ اگر وہ درست ہوں تو پھر موضوع کی طرف آتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا کی طرح راقم بھی دوسری طرح کے نقادوں کا طرفدار ہے اور اپنی تنقید میں فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو اولیت دیتا ہے۔

جوش کی نظم کے فنی تجزیے سے پہلے خواجہ محمد زکریا نظم کی فنی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

بتاتے ہیں کہ نظم کے لیے سب سے بڑی خوبی ارتقائے خیال کی ہے۔ اس کے بعد وہ جوش کی نظم کے بارے میں آل احمد سرور کی رائے جس میں انھوں نے جوش کو "نظم کے سانچے کا آرٹسٹ" قرار دیا تھا، کا تجزیہ کرتے ہیں اور جوش کی مشہور نظم "ترانہ یگانگی" کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے کی تصدیق کرتے ہیں کہ اصل میں جوش کی نظمیں، ان کی غزلوں ہی کا ایک روپ ہیں۔ میرے خیال میں فنی اعتبار سے جوش کی نظم کو غزل قرار دے کر خواجہ صاحب اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ جوش کی نظموں میں ارتقائے خیال موجود نہیں بلکہ ریزہ خیالی موجود ہے جو کہ غزل کی خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دیا تھا۔

اس سے آگے چل کر وہ جوش کی نظموں کی ایک اور خامی کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ جوش کی نظموں میں غزلیت ہی نہیں قصیدہ گوئی بھی پائی جاتی ہے۔ جوش کی نظموں کے فنی نقائص کی طرف اشارہ کر کے دراصل خواجہ محمد زکریا جوش کی نظم پر سخت گرفت کر رہے ہیں اور اس کے لیے ان کے پاس فنی اور جمالیاتی جواز موجود ہے۔

پریم چند بیسویں صدی کے آغاز کی نہایت قد آور شخصیت ہے جس نے اُردو افسانے اور اُردو ناول پر دیرپا نقوش ثبت کیے ہیں۔ پریم چند کی ناول نگاری پر زیرِ نظر کتاب میں دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون "پریم چند کی ناول نگاری" ہے۔ اپنے اس مضمون کا آغاز بھی خواجہ صاحب پریم چند کے بارے میں اختر حسین رائے پوری اور آل احمد سرور وغیرہ کی اس رائے کو رد کرتے ہیں کہ پریم چند کے افسانے ان کے ناولوں سے بہتر ہیں۔ خواجہ محمد زکریا کی رائے ان ناقدین سے مختلف ہے اور وہ بڑی دلیل سے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کا تقابل کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"پریم چند کے تمام افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان کے ناول اور افسانے تقریباً ایک ہی معیار کے حامل ہیں۔ ناولوں میں کچھ فنی کوتاہیاں پائی جاتی ہیں تو افسانے بھی ان سے کلیتاً بری نہیں۔ افسانوں میں وہ ناولوں کے مقابلے میں اگر کسی قدر زیادہ کامیاب رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک وسیع مشاہدہ کرنے والا فن کار جس نے بہت لکھا ہو وہ بعض معیاری افسانے لکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔"(۱۹)

پریم چند کی ناول نگاری کے بارے میں خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ اگر ہم پریم چند کی ناول

نگاری کو بہتر طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے ناولوں کو دو ادوار میں تقسیم کر کے دیکھنا ہوگا۔ یہاں وہ ڈاکٹر قمر رئیس اور مدن گوپال کے تحقیقی کام کو سراہتے ہیں کہ ان دو حضرات کی تحقیق کے نتیجے میں پریم چند کی ناول نگاری کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا پریم چند کی ناول نگاری کی ادوار بندی موضوع کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں پہلے دور میں پریم چند کی ساری توجہ ہندوؤں کے مسائل پر رہی ہے جبکہ دوسرے دور میں وہ سیاسی اور اقتصادی معاملات کو زیادہ وسیع بنیادوں پر دیکھتے ہیں۔ اصلاحِ معاشرہ کی لگن اور کوشش ان کے دونوں ادوار میں مشترک ہے۔ پریم چند کی خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس کی ناول نگاری کے بارے میں درج ذیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"پریم چند نے اُردو ناول کو معاشرتی مسائل کے حوالے سے بھی اپنے ناولوں میں برابر کا شریک رکھا۔ اُردو ناولوں میں شہری مرقع کشی موجود تھی۔ پریم چند نے دیہاتوں کی زندگی کو پیش کیا۔ دیہاتی مسائل اور دیہاتی عوام سے متعلق ان کی نظر وسیع اور مشاہدہ گہرا ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ذاتی تجربے کی بناء پر لکھا۔ سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کیا۔ انھوں نے ادب کو ماضی کا عکاس بنانے کی بجائے حال کی آواز بنایا۔ ان کے ناولوں میں بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کا سارا ہندوستان زندہ ہو گیا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اتنی ساری خوبیوں کے ہوتے ہوئے انھوں نے تکنیک کی طرف سے کچھ لاپرواہی برتی ہے۔ گویا ایک اچھے ناول کا خام مواد ان کے ہاں موجود ہے لیکن اس کی مدد سے انھوں نے کوئی عظیم الشان ناول نہیں لکھا۔"(۲۰)

اس سے متصل مضمون "پریم چند کا ایک اور ناول میدانِ عمل" کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ پریم چند کا یہ ناول ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیان لکھا گیا۔ پہلے یہ ۱۹۳۲ء میں "کرم بھومی" کے عنوان سے ہندی زبان میں شائع ہوا اور اُردو میں اس کے چھپنے کی نوبت پریم چند کی وفات کے بعد آئی۔ پریم چند کے وہ افسانے اور ناول جو پہلے ہندی میں شائع ہوئے اور بعد میں اُردو میں، ان کے بارے میں ایک سوال بار بار قاری کے ذہن میں آتا ہے کہ کیا ان ناولوں اور افسانوں کو ہندی کے تراجم کے طور پر پڑھا جائے یا اُردو تخلیق کے طور پر۔ اُردو تنقید میں ابھی اس نکتے کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔

خواجہ محمد زکریا "میدانِ عمل" کو بہ اعتبار موضوع پریم چند کے دوسرے دور کے ناولوں میں شامل کرتے ہیں۔ اس ناول میں بھی ہندوستان کے سیاسی اور اقتصادی حالات کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں ہندوستان کی شہری زندگی کا احوال زیادہ ہے۔ ساہوکاروں کی خود غرضیاں، سرکاری

عمال کی ریاکاریاں، شہر میں غریب لوگوں کا احوال، حاکم انگریزوں کی دراز دستیاں، ہندو پنڈتوں کی ہوس کاریاں، کسانوں کی بے بسی، غرض ہندوستان کی معاشرتی اور معاشی زندگی کی بڑی بھرپور انداز میں عکاسی ہمیں اس ناول میں ملتی ہے۔ اس ناول کی معنویت یہ ہے کہ اس کے کردار اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں تبدیلی لانے کے عمل میں کوشاں ہیں۔ خواجہ محمد زکریا ناول کا فنی و فکری جائزہ لینے کے بعد اگرچہ پریم چند کے اس ناول کو زیادہ بڑا ناول ماننے پر تیار نہیں مگر وہ اس ناول میں ہندوستان کی وسیع عکاسی کو بہرحال کامیاب قرار دیتے ہیں۔

پریم چند سے خواجہ محمد زکریا کی دلچسپی صرف ان کے ناولوں تک محدود نہیں۔ انھوں نے پریم چند کے افسانوں کا ایک انتخاب "پریم چند کے بہترین افسانے" کے نام سے مرتب کیا تھا اور اس کا دیباچہ بھی تحریر کیا تھا۔ اپنے دیباچے میں انھوں نے پریم چند کی افسانہ نگاری کی خوبیوں اور خامیوں پر گفتگو کرتے ہوئے۔ اپنے "دیباچہ" کے آغاز میں وہ پریم چند کو اردو کا اولین افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ مگر بعض ناقدین نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے راشد الخیری کو پہلا افسانہ نگار قرار دیا۔ اس جانب سب سے پہلے اشارہ تو مسعود رضا خاکی نے اپنے تحقیقی مقالے "اردو افسانے کا ارتقا" میں کیا تھا جسے بعد میں بنیاد بنا کر انوار احمد نے اردو افسانے پر اپنے تحقیقی مقالے "اردو افسانہ" تحقیق و تنقید" میں آگے بڑھایا۔ انوار احمد نے اپنا مقالہ خواجہ محمد زکریا کے زیر نگرانی مکمل کیا۔ ظاہر ہے یہ بات ان کی نظر سے گزری ہوگی اور انھوں نے ایک سچے محقق کی مانند اپنے شاگرد کی بات کو رد نہیں کیا بلکہ اسے اپنے مقالے میں درج کرنے دیا ہے۔ زیر نظر کتاب ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی اس کے بعد اس کا کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ خواجہ صاحب اپنی اس رائے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتے۔ کیوں کہ ان کی اپنی تحریروں میں اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ جب انھیں اپنی رائے میں تبدیلی کا جواز اور ثبوت مل جاتا ہے وہ بجا طور پر اپنی بات پر اصرار نہیں کرتے۔ میرے خیال میں یہ خواجہ زکریا کی ایسی خوبی ہے جو ہمارے ہاں بہت کم نقادوں میں پائی جاتی ہے۔

خواجہ محمد زکریا نے پریم چند کے افسانوں کے اپنے انتخاب کے بارے میں بڑے واضح انداز میں بات کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ انتخاب کیوں کیا گیا اور اس سے پریم چند شناسی میں کیا بہتری آنے کی توقع ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پریم چند کے بہترین افسانے کے نام سے یہ مجموعہ ان کے تمام مجموعوں کا مظہر ہے۔ اس انتخاب

سے پریم چند کے افسانوں کی تمام خصوصیات واضح ہو جائیں گی۔ البتہ ان کی فنی کمزوریاں ظاہر نہ ہوں گی جن سے روشناسی کے لیے ان کے مجموعے تمام و کمال پڑھنے ہوں گے۔ اس اعتبار سے یہ پریم چند کے بہترین افسانے ہیں مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو پریم چند کے افسانوں کی محض تاریخی اہمیت کے قائل ہیں، اس انتخاب کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے میں تبدیلی محسوس کریں گے لیکن جو لوگ ان کے فن کی عظمت کے قائل ہیں ان کے لیے یہ انتخاب یقین کو محکم کرنے کی بنیادیں مہیا کرے گا۔"(۴۱)

خواجہ محمد زکریا نے اپنے انتخاب میں جن تیرہ افسانوں کو جگہ دی ہے وہ یہ ہیں ۱۔ راہِ نجات ۲۔ قزاقی ۳۔ عیدگاہ ۴۔ مجبوری ۵۔ دودھ کی قیمت ۶۔ دو سکھیاں ۷۔ ڈامری ۸۔ خانہ داماد ۹۔ بڑے بھائی ۱۰۔ پنچایت ۱۱۔ دو بیل ۱۲۔ طلوعِ محبت ۱۳۔ کفن۔ جن لوگوں نے پریم چند کے افسانوں کو پڑھ رکھا ہے وہ ایک نگاہ ڈال کر ہی خواجہ صاحب کے ذوقِ انتخاب کی داد دے سکتے ہیں۔ ان سے ہٹ کر پریم چند کے شاید ہی کسی افسانے کا نام لیا جا سکے جس فنی اور جمالیاتی حوالوں سے پریم چند کے بہترین افسانوں میں جگہ دی جا سکے۔

اب ہم آتے ہیں واپس "نئے پرانے خیالات" کی جانب اور اس میں شامل مضمون "تاریخ ادبِ اردو..... (محمد صادق) پر ایک نظر" کا جائزہ لیتے ہیں۔ اپنے مضمون کا آغاز خواجہ محمد زکریا اس چونکانے والے جملے سے کرتے ہیں۔

"یوں تو اردو ادب کے بارے میں کئی تاریخیں لکھی گئیں۔ لیکن یہ امر انتہائی افسوس ناک ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی تسلی بخش نہیں۔"(۴۲)

جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ تحقیق خواجہ صاحب کا خصوصی میدان ہے اور اس میں تاریخ نگاری کے فنی رموز سے وہ پوری طرح آگاہ ہیں۔ اس بات کا اندازہ ہمیں محمد صادق کی زیرِ نظر "تاریخ ادبِ اردو" کے ان کے تنقیدی تجزیے سے بھی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب محمد صادق کی اس کتاب کو اپنے موضوع پر اس وقت تک لکھی جانے والی اہم کتاب قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد اس کتاب میں پائی جانے والی بعض خامیوں اور تحقیقی اغلاط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا کی تنقید کی خوبی یہ ہے کہ نہ تو وہ مدلل مداحی کرتے ہیں اور نہ کسی سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں لیکن وہ جس حد تک ممکن ہو معروضی انداز میں فنی جائزہ لیتے ہیں اور تصنیف کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ بہر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ محمد صادق کی کتاب "تاریخ ادبِ اردو" A Histry of Urdu Literature پر

لکھے جانے والے بہت عمدہ مضامین میں بلاشبہ خواجہ صاحب کا یہ مضمون بھی شامل ہے۔

اس کتاب میں شامل آخری دو مضامین "دہلی کا دبستان شاعری" اور "لکھنؤ کا دبستان شاعری" بھی نہایت قابل توجہ ہیں کہ ان مضامین میں اردو شاعری کی ایک اہم بحث کا تنقیدی احاطہ کیا گیا ہے۔ بہر طور پر خواجہ زکریا کی زیر نظر کتاب "نئے پرانے خیالات" پر گفتگو کا اختتام ہم ان کے استاد اور اردو کے ایک اور اہم نقاد اور محقق ڈاکٹر وحید قریشی کی اس رائے پر کرتے ہیں:

"خواجہ محمد زکریا کے یہ مضامین بعض مشہور شاعروں، ناول نویسوں اور ادبی تحریکات سے متعلق ہیں لیکن خواجہ صاحب روش عام سے ہٹ کر بات کرنے کے عادی ہیں۔ انھوں نے ان موضوعات میں بھی ادبی مسائل اور شخصیتوں کے بعض نئے پہلو دریافت کیے ہیں انھوں نے ادب کی بندھی ٹکی آرا اور بعض شعرا و ادبا کے بارے میں مدرسانہ انداز میں بیان کی گئی باتوں کو قبول نہیں کیا بلکہ شعرا و ادبا کے کلام اور نثر پاروں سے براہ راست اپنی رائے متعین کی ہے۔ یہ بات وقت طلب بھی ہے اور انتقادی بھی۔ خواجہ صاحب اپنے اسلوب ہی میں نہیں بلکہ ادبی تجزیے میں بھی ایک خاص طرح کا جارحانہ انداز رکھتے ہیں لیکن اس تجزیاتی نقطہ نظر میں وہ کہیں بھی بعض دوسرے نقادوں کی طرح جذباتی ہو کر ہنگامی انداز کی جملہ بازی پر نہیں اترتے۔ ان کی باتیں تلخ و تند ہو سکتی ہیں، ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مجموعی اعتبار سے اس تنقید کی دلکشی اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یک رخے نہیں۔ شاعری اور افسانوں میں بیک وقت تنقیدی بصیرت رکھتے ہیں بلکہ ناول کے سلسلے میں ان کے تجزیاتی مطالعے پریم چند کو ایک بالکل نئے زاویے سے دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ افسانے کی تنقید میں اب تک ہمارے قارئین جس بندھے ٹکے کلام کے عادی رہے ہیں، خواجہ صاحب ان سے یکسر مختلف ہیں، زیادہ وقیع اور بہتر نظام تنقید پیش کرتے ہیں۔" (۲۳)

خواجہ محمد زکریا کی تنقید کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی کا طویل اقتباس اس لیے نقل کیا گیا ہے کہ اس میں دو تین بہت اہم باتیں کی گئی ہیں۔ پہلی بات تو بقول ڈاکٹر وحید قریشی یہ ہے کہ خواجہ محمد زکریا کی تنقید روش عام سے ہٹ کر ہے۔ دوسری وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس میں نئے پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ تیسرے وہ بندھی ٹکی باتوں سے گریز کر کے تخلیق اور تخلیق کار کے براہ راست مطالعہ سے اپنی رائے متعین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے جن تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سب ایک اچھے نقاد کی نشانیاں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے خواجہ صاحب کی تنقید میں جارحانہ انداز کی نشاندہی بھی کی ہے۔ میرے خیال میں ہر اچھے نقاد میں کسی حد تک جارحانہ انداز کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر تو تنقید پھسپھسی ہو جاتی ہے۔

چند اہم جدید شاعر

خواجہ محمد زکریا کا سب سے اہم تنقیدی مجموعہ "چند اہم جدید شاعر" ہے۔ اس مجموعے کی اولین اشاعت ۲۰۰۲ء میں ہوئی تو اس میں کل چودہ مضامین اور مجید امجد کا ایک انٹرویو بھی شامل تھا۔ ۲۰۱۹ء میں اشاعت دوم کے وقت اس میں پانچ مضامین کا مزید اضافہ کیا گیا۔ "چند اہم جدید شاعر" میں وہ مضامین شامل ہیں جو ۱۹۷۰ء کے بعد لکھے گئے اور ان کا موضوع جدید شاعری اور جدید شاعر ہے۔ "چند اہم جدید شاعر" میں ہمیں خواجہ صاحب کی ایک اور جہات سے روشناسی ہوتی ہے اور وہ ہے خاکہ نگاری، یعنی اس میں تنقیدی مضامین اور خاکے دونوں شامل ہیں اور بعض تحریریں دونوں کا امتزاج ہیں۔ اس کتاب میں شامل مضامین کا موضوع وہ شاعر ہیں جن سے خواجہ محمد زکریا کے ذاتی تعلقات رہے ہیں۔ اس لیے ان مضامین میں ہمیں محقق اور نقاد کے درمیان ذاتی تعلق کی نشانیاں بھی ملتی ہیں۔ خود خواجہ محمد زکریا اپنے پیش نظر تنقیدی مجموعے کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں کہ:

"ان میں سے بعض شخصی خاکے ہیں، بعض تنقیدی مضامین ہیں اور بعض تحریروں میں دونوں کا امتزاج ہیں۔ چند مضامین میں یادیں شخصیت نگاری پر حاوی ہیں۔ اس لیے ان سب مضامین کو کسی ایک انداز و روش کے تحت شمار کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ حسن اتفاق سے جن شعرا کو موضوع بنایا گیا ہے ان سے میرے کم یا زیادہ تعلقات رہے ہیں۔" (۴۳)

"چند اہم جدید شاعر" کی پہلی اشاعت میں جو مضامین شامل نہیں تھے اور دوسری اشاعت کا حصہ بنے، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ راشد کی نظم: ابولہب کی شادی
۲۔ فیض کی شاعری پر دوسری نظر
۳۔ مجید امجد..... شاعر حیات و کائنات
۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا..... ایک منفرد شاعر
۵۔ شہزاد احمد بطور نظم گو

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے کہ خواجہ محمد زکریا اپنی تنقید میں تکامل سے کافی کام لیتے ہیں۔ اپنی زیر نظر کتاب کے دیباچے میں وہ عصر اقبال کے بعد کے تین اہم شاعروں راشد، فیض اور مجید امجد کا

شاعرانہ تقابل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"میں راشد، فیض اور مجید امجد کو عصرِ اقبال کے بعد اُردو کے اہم ترین شعرا میں شمار کرتا ہوں۔ میری دانست میں میراجی سمیت دیگر تمام جدید شعرا ان تک نہیں پہنچتے۔ راشد اور فیض ہم عصر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے ہاں بعض جگہ موضوعات کا اشتراک بھی ہے لیکن اسلوب اتنا مختلف ہے کہ کلام الگ پہچانا جاتا ہے۔"

"راشد اور فیض دو دریا ہیں۔ ایک پر شور اور تیز رو جبکہ دوسرا آہستہ رو اور ہموار ہے۔ جبکہ مجید امجد ایک سمندر کی طرح وسیع اور بے کنار ہے۔ فیض اپنے ملائم اور دھیمے اسلوب اور عام پسند موضوعات کی وجہ سے مقبولیت میں دوسروں کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ راشد کے ہاں ابہام ہے اور نئے نئے اسلوبی سانچے بکثرت بنائے گئے ہیں۔ اس لیے انھیں سمجھنا خاصا دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں قارئین کے وسیع حلقے میں مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ مجید امجد حتی الامکان ابہام سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں تجربات کی نوعیت بڑی منفرد ہے اور وہ الفاظ و تراکیب کو ان تجربات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک نئی شعری زبان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی تفہیم بھی کار دشوار ہے لیکن انھیں ڈوب کر پڑھا جائے تو یہ کاوش بڑی ثمر آور بھی ہیں۔"(۲۵)

آپ ملاحظہ کریں کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا چند جملوں میں تین اہم ترین جدید شاعروں کے اشتراکات اور امتیازات واضح کر دیتے ہیں۔ اور ان شاعروں کی تفہیم کے لیے کلید بھی فراہم کر دیتے ہیں۔

"چند اہم جدید شاعر" میں ابتدائی دو مضامین حفیظ جالندھری کے بارے میں ہیں۔ ان دو مضامین کے بارے میں خود انھوں نے اپنے ابتدائیہ میں انھیں "تقریباتی" قرار دیا ہے۔ مگر یہ مضامین صرف تقریباتی نہیں۔ خاص طور پر دوسرا مضمون "حفیظ کی غزل" ایسا نہیں کہ اسے تقریباتی کہہ کر نظر انداز کیا جا سکے۔ حفیظ جالندھری کی غزل گوئی کا فنی اور فکری تجزیہ کرنے کے بعد وہ نتیجہ نکالتے ہیں:

"حفیظ کا فن شروع سے آج تک سہل گوئی کا فن ہے۔ ان کے ہاں ژولیدہ بیانی کا شائبہ تک نہیں۔ مصرعے ایسے ڈھلے ڈھلائے اور چست ہیں جو داغ کے لیے بھی قابلِ رشک ہوں۔"(۲۶)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

حفیظ جالندھری کی سادگی وہ ہے جو بڑی ریاضت کے بعد ہاتھ آتی ہے اور بہت سے شاعر تو ریاضت کے بعد بھی اسے حاصل نہیں کر پاتے۔ یہ سادگی سپاٹ نہیں ہے، بڑی عیار سادگی ہے۔ عموماً

پڑھنے والے کو دھوکا دے جاتی ہے۔ اسے بہت زیادہ توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔"(۴۷)

حفیظ جالندھری کی شاعری کے بارے میں اتنا بلیغ اور بامعنی تنقیدی جملے کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کے بعد دو مضامین عبدالحمید عدؔم کے حوالے سے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے عبدالحمید عدم سے اپنی چند ملاقاتوں کا احوال بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ جبکہ "عدم کے شعری مجموعے" میں انھوں نے عبدالحمید عدم کے حوالے سے بعض بڑی دلچسپ باتیں کی ہیں:

"عدم سے تھوڑی سی ذاتی واقفیت ہونے کی بناء پر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی ان سے ان کے مجموعوں کی تعداد اور کلام کی مقدار کے بارے میں سوال کرتا تو وہ تسلی بخش جواب نہ دے پاتے۔ ان کی طبیعت میں اتنی بے نیازی تھی کہ وہ جہاں جاتے ایک آدھ بیاض بھول آتے اور زود نویسی کی اتنی صلاحیت رکھتے تھے کہ دو چار منٹ میں غزل مکمل کر لیتے تھے۔"(۴۸)

عبدالحمید عدم کے بارے میں خواجہ محمد زکریا کی سب سے زیادہ طویل تحریر ان کے مرتب کردہ کلیات عبدالحمید عدم میں شامل ہے۔ اس میں وہ عدم کی شاعری کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"عدم نے پاکستانی غزل میں سہل ممتنع اور ترنم و سے ساختگی کی حامل غزلوں کا ایک ایسا رجحان پیدا کیا کہ دو تین دہائیوں تک اس غزل کی تقلید ہر شہر اور ہر قصبے میں کی گئی۔ بعض مشہور شاعر بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے لیکن کم معروف شعرا کی ایک فوج ظفر موج تھی جو عدم کی غزلوں کی زمینوں میں خامہ فرسائی کرنے لگی۔ بعض اوقات وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے اور ان کے اشعار پر عدم کے اشعار کا دھوکا ہونے لگتا تھا لیکن اصل اصل ہوتا ہے اور نقل نقل۔"(۴۹)

خواجہ محمد زکریا نے تین مختلف جگہوں پر عبدالحمید عدم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر انھیں ملا کر پڑھا جائے تو ہمارے لیے عدم کی شاعری کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ ن۔م۔راشد اور فیض احمد فیض کے بارے میں دو دو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ راشد، فیض اور مجید امجد کے شاعرانہ موازنے پر ہم خواجہ صاحب کی وقیع رائے اوپر درج کر چکے ہیں۔ یہاں ہم پہلے ن۔م۔راشد کے بارے میں ان کے مضامین پر بات کرتے ہیں۔

"ن۔م۔راشد: آزاد اردو نظم کا نمائندہ" راشد کی شاعری کے بارے میں لکھا جانے والا ایک مبسوط مضمون ہے۔ جس میں راشد کی شاعری کا تدریجی جائزہ لیا گیا ہے۔ بات "ماورا" سے شروع کر

کے "گماں کا ممکن" تک لائی گئی ہے۔ مجموعہ وار راشد کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اور اس میں آنے والی تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے خواجہ محمد زکریا اپنے مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں:

"راشد ہمارے جدید شاعروں میں یقیناً ایک اہم نام ہیں۔ انھوں نے مغربی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مغرب کی کلاسیکی شاعری کے ساتھ ساتھ جدید شاعری سے بھی انھیں بہت لگاؤ تھا۔ شاعری کی جدید تحریکیں خواہ وہ لاطینی امریکہ میں ہوں یا افریقہ میں یا کہیں اور..... راشد کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ انھوں نے ان تحریروں سے استفادہ کیا لیکن ایشیا کے مسائل کو مدنظر رکھ کر موضوعات منتخب کیے۔ ان کے ہاں فکری شاعری زیادہ ہے جس میں ہم عصر سیاسی اور ادبی تحریکوں سے انسپریشن حاصل کی گئی ہے۔ مغربی ادب کو براہ راست پڑھ کر اور اس سے اثر پذیر ہو کر، اردو شاعری میں متعدد تازہ تجربات کو پیش کرنے اور آنے والے شعرا کی پوری نسل کو متاثر کرنے کی وجہ سے ن۔م۔ راشد کی اہمیت مسلم ہے۔" (۳۰)

ن۔م۔ راشد اردو کے ایسے جدید شاعر ہیں جن کے بارے میں تنقیدی آرا میں افراط و تفریط زیادہ ملتی ہے اور متوازن انداز میں ان کی شاعری کو کم کم سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے بڑے متوازن انداز میں راشد کی شاعری کے بنیادی خد و خال کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے اور ان ذرائع کی نشاندہی بھی کر دی ہے جس سے راشد نے اثرات قبول کیے۔ تنقید راشد میں اس مضمون کو ایک اچھی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ محمد زکریا کا دوسرا مضمون "راشد کی نظم: ابوالہب کی شادی" راشد کی ایک نظم کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔ انھوں نے اس نظم میں پائے جانے والے ابہام کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور راشد کے اس سہو کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں اس نے الف لیلہ کے ایک کردار ابوالحسن کو ابوالہب سے غلط ملط کر دیا ہے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ محمد زکریا کتنے وسیع المطالعہ شخص ہیں۔

فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ اہم ترین شاعر مانے جاتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے ان کے بارے میں بھی دو مضامین تحریر کیے ہیں۔ فیض احمد فیض پر انھوں نے پہلا مضمون ۱۹۹۳ء میں لکھا۔ اس مضمون میں فیض کی بعض عروضی اور فنی اغلاط کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ رائے بھی دی تھی کہ شاید وقت کے ساتھ ساتھ فیض اپنی مقبولیت کو باقی نہ رکھ سکیں اور مومن کی طرح غالب کے سائے میں گم ہو جائیں۔ زیر نظر کتاب کی دوسری اشاعت میں اس مضمون کے آخر پر ایک نوٹ کا اضافہ کر کے انھوں

نے اپنی تنقیدی دیانت کا ہی ثبوت نہیں دیا بلکہ اپنی رائے سے رجوع کرنے کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ نوٹ کچھ یوں ہے۔ ''فیض کی بڑھتی ہوئی مقبولیت آج ربع صدی پہلے لکھی ہوئی میری رائے کی تردید کر رہی ہے۔''(۳۱)

فیض کے حوالے سے ان کا دوسرا مضمون ''فیض کی شاعری پر دوسری نظر'' اس تبدیلی کی وضاحت کرتا ہے جو فیض کی تفہیم میں خواجہ محمد زکریا کے ہاں آئی۔ اب وہ فیض کی شاعری میں سے بہترین نمونوں کا انتخاب کرتے ہیں اور فیض کی شاعری کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''یہ فیض کی بہترین شاعری کے چند نمونے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ان کی اعلیٰ شاعری انھی مثالوں تک محدود ہے۔ وقت اور جگہ کی کمی کے سبب حوالے کم دیے گئے ہیں۔ فیض جانتے ہیں کہ انقلاب جلد نہیں آئے گا۔ اس کے لیے منظم کوششیں کرنا ہوں گی۔ قربانیاں پیش کرنی ہوں گی۔ عوام کو شعور بخشنا ہوگا۔ ایک طویل جدوجہد سے گزر کر ہی اچھی اقدار کا فروغ ہوگا۔ ابھی تو لوگوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں۔ انسانوں کے پیٹ کا تنور بھرنا، موسموں کے شدائد کے مطابق لباس اور سکونت، بیماریوں کے لیے علاج معالجہ، آگاہی حاصل کرنے کے لیے صلاحیت کے مطابق تعلیم ان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ فیض کی شاعری ایک خوبصورت فضا بناتی ہے جو ہمیں کھردری حقیقت نگاری سے کہیں زیادہ آگاہی بخشتی ہے اور یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ ہم انسانوں کے دکھوں کا مداوا کرنے کی بھرپور سعی کریں۔''(۳۲)

یہ مضمون ۲۰۱۹ء کا تحریر کردہ ہے اور اس تبدیلی کی جانب واضح اشارہ کرتا ہے جو خواجہ محمد زکریا کے ہاں بالخصوص فیض احمد فیض کی شاعری اور بالعموم ادب کے معاشرتی منصب کے حوالے سے ان میں آئی ہے۔

خواجہ محمد زکریا شخصی اعتبار سے تعلق نبھانے والے فرد ہیں اور اس کی ایک یادگار ان کا ''شیر افضل جعفری''..... جھنگ کا قلندر ہے۔ شیر افضل جعفری انیسویں صدی تیسری ربع میں اردو ادب کے منظر پر بطور اہم شاعر موجود تھے۔ مگر اپنی وفات کے بعد وہ رفتہ رفتہ منظر سے غائب ہوتے چلے گئے۔ خواجہ صاحب کا زیرِ نظر مضمون شیر افضل جعفری کی شاعری کو اردو ادب کے قارئین سے متعارف کروانے کی اچھی کاوش ہے۔

اس تنقیدی مجموعے میں خود خواجہ محمد زکریا کی نشاندہی کے مطابق تین خاکے ''سید جعفر طاہر۔ گل خاردار''، ''علاؤ الدین کلیم..... روشنی کی جستجو'' اور ''مجید امجد کے بارے میں'' شامل ہیں۔ ان کے بارے

میں بات آگے چل کر نظم نگاری کی ذیل میں آئے گی۔ اب ہم آتے ہیں ان کے مضمون "ناصر کاظمی کی پہلی بارش" کی طرف۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد شاعروں اور ادیبوں کی جو نسل اُردو ادب کے منظرنامے پر ابھری تھی ان میں ناصر کاظمی نہایت معتبر نام ہے۔ ناصر کاظمی نے اپنی شاعرانہ حیثیت منوانے کے بعد اپنی کتاب "پہلی بارش" میں ایک نیا تخلیقی تجربہ کیا۔ "پہلی بارش" غزل کی ہیئت میں ہے لیکن غزل مسلسل کی صورت میں پوری کتاب ایک وحدت میں پروئی ہوئی ہے۔ پہلی بارش میں شامل 24 غزلیں ایک ہی زمین میں لکھی گئی ہیں اور معنوی طور پر مربوط ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے اس کتاب کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں شامل ان کا مضمون "ڈاکٹر وزیر آغا..... ایک منفرد شاعر" 2018ء کا تحریر کردہ ہے اور یوں سب سے زیادہ تازہ مضمون ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی زیادہ شہرت تو ان کی تنقید اور انشائیہ نگاری کے بارے میں ہے۔ اس باعث ان کی شاعرانہ حیثیت کچھ دب سی گئی ہے۔ شاید یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ وزیر آغا کے چودہ شعری مجموعے شائع ہوئے ان کا شعری سفر ان کی کتاب "دن کا زرد پہاڑ" (۱۹۶۹ء) سے شروع ہو کر "ہوا تحریر کر مجھ کو" (۲۰۰۹ء) تک آتا ہے جو ان کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری مجموعہ تھا جبکہ ایک مجموعہ "کاسۂ شام" ان کی وفات کے بعد ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ وزیر آغا نے نظم اور غزل ہر دو اصناف میں شاعری کی۔ خواجہ زکریا کا خیال ہے کہ وزیر آغا زیادہ کامیاب نظم گو شاعر ہیں اور ہمیں ان کی رائے سے اختلاف کی گنجائش دکھائی نہیں دیتی۔ اپنے زیرِ نظر مضمون میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، وزیر آغا کی شاعری کا ان کے معاصرین سے موازنہ کر کے اس کی انفرادیت نمایاں کرتے ہیں۔

اسی تسلسل میں ہم خواجہ محمد زکریا کے مضمون "شہزاد احمد کی نظم نگاری" پر بات کر سکتے ہیں۔ شہزاد احمد جدید اُردو شاعری بالخصوص جدید اُردو غزل کا اہم حوالہ ہیں مگر خواجہ زکریا شہزاد احمد کی نظم نگاری کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں نقاد ہمیں اس طریقہ کار سے بھی آگاہ کرتا ہے جس پر عمل کر کے شہزاد احمد کی شاعری کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اپنے مضمون کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں کہ:

"شہزاد کے ہاں نظموں کے بنانے کے لیے وہی ماڈل پیشِ نظر رکھا گیا ہے جہاں قاری کو فری ایسوسی ایشن کی تفہیم کے لیے نظم ڈھانچے اور امیجری سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ یہ مشق بے ثمر نہیں ہے۔ اس ریاضت میں اسے بعض اچھی نظمیں مل جاتی ہیں اور نظموں کے بے شمار اچھے ٹکڑے دستیاب ہو جاتے ہیں، جنھیں قاری بار بار پڑھ کر لطف اندوز بھی ہو سکتا ہے اور اپنے ویژن کو بھی وسیع کر سکتا ہے۔" (۳۳)

خواجہ محمد زکریا کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں کا ایک مرکزی حوالہ "مجید امجد" ہے۔ مجید امجد کی کتاب "شبِ رفتہ" پر ان کا مضمون "مجید امجد کی شبِ رفتہ" 1972ء کی یادگار ہے جبکہ ان کا مضمون "مجید امجد..... شاعرِ حیات و کائنات" ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ اس دوران انھوں نے متعدد بار مجید امجد کے حوالے سے قلم اٹھایا ہے اور اس کتاب میں شامل ان کی چھ تحریریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ۱۹۸۵ء میں پہلی بار "کلیاتِ مجید امجد" مرتب کر کے اردو شاعری کے قارئین کے لیے مجید امجد کے سارے کلام تک رسائی ممکن بنائی۔ اس کلیات کے اب تک کئی اردو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جو شعر و ادب سے بے اعتنائی کے اس دور میں نہ صرف ہمیں حیرت سے دوچار کرتے ہیں بلکہ مجید امجد کی بطور اہم ترین جدید شاعر کی شہرت کی گواہی بھی دیتے ہیں۔ "مجید امجد" کے حوالے سے اگر کسی فردِ واحد نے مسلسل اور تواتر کے ساتھ تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے تو وہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ہیں۔ "مجید امجد" اپنی وفات کے بعد مسلسل اردو ادب کے منظر پر چمکتے روشن ستارے کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا ہے تو اس میں بلاشبہ سب سے زیادہ داد کے حق دار خواجہ صاحب ہیں۔

"مجید امجد..... شاعرِ حیات و کائنات" کو میں مجید امجد کی شاعری پر لکھا جانے والا بہترین مضمون سمجھتا ہوں جس میں "مجید امجد" کی شاعری کو وسیع فنی اور فکری تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ خواجہ محمد زکریا کے بھی چند اہم مضامین میں سے ایک ہے۔ انھوں نے اپنا زیرِ نظر مضمون ان سطور پر ختم کیا ہے۔

"مجید امجد موضوعات کی وسعت، اسالیب کی رنگا رنگی، مشاہدے کے غیر معمولی تنوع، الفاظ و تراکیب کی انوکھی ساخت اور گہری دردمندی کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری بے پناہ موضوعاتی وسعت و گہرائی اور لسانی تشکیلات سے مالا مال ہے۔ یہ لسانی تشکیلات من مرضی سے تیار کی ہوئی نہیں ان کی بنیاد قواعدِ زبان پر ہے اور ان کے پس منظر میں مختلف زبانوں کا اعلیٰ ترین ادب موجود ہے۔ اس کے باوجود اس میں گہری دردمندی ہے۔ اتنی خود ساختہ تراکیب کے باوجود ان کے کلام میں اتنی گہری تاثیر موجود ہے کہ تاثیر اور صنعت کے متضاد عناصر گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ متضاد خصوصیات کو ہم آہنگ کرنے والی یہ شاعری اپنی تفہیم کے لیے سرسری نظر سے پڑھنے کی نہیں، گہری توجہ اور محنت کا تقاضا کرتی ہے۔" (۳۳)

مجید امجد کے حوالے سے خواجہ محمد زکریا کی زیرِ نظر کتاب میں شامل تحریریں، مجید امجد کے کلیات، مختلف ایڈیشنوں میں شامل نثری تحریریں اور دیگر تحریریں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، اگر ان سب کو ملا کر ایک

مسبوط کتاب بنا دیا جائے تو نہ صرف تفہیم مجید امجد میں آسانی ہوگی بلکہ خواجہ صاحب کا کام بھی نمایاں ہو جائے گا۔

تاثراتی اور تنقیدی تحریریں (مرتبہ: ڈاکٹر آصف علی چٹھہ)

"تاثراتی اور تنقیدی تحریریں" 35 تحریروں پر مشتمل ہیں اور اسے کتاب کے مرتب ڈاکٹر آصف علی چٹھہ نے تین ذیلی عنوانات "شخصیت اور فن" "تعارف و تاثر" اور "تنقید و تحقیق" میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دو ذیلی عنوانات والی تحریروں پر تو بات آگے چل کر ہو گی۔ تیسرے عنوان "تنقید و تحقیق" میں شامل بعض تحریروں پر ہم "چند اہم جدید شاعر" میں بات کر چکے ہیں۔ البتہ اس میں تین چار ایسی تنقیدی تحریریں ضرور شامل ہیں جن پر یہاں بات کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس میں پہلی تحریر تو "کچھ غالب کے بارے میں" ہے۔ اس مضمون میں خواجہ محمد زکریا نے غالب کے حوالے سے چند عمومی پہلوؤں کو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا ہے اور غالب کی شاعری کو سمجھنے کی جانب کچھ مفید اشارے کیے ہیں۔

"نقوش کا غزل نمبر" رسالہ نقوش کے غزل نمبر کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ ہے اور اسے ۱۹۸۷ء میں تحریر کیا گیا۔ یعنی یہ کوئی فوری ردِ عمل نہیں بلکہ بہت سوچا سمجھا مضمون ہے۔ انھوں نے اس غزل نمبر کی اشاعت پر محمد طفیل کی ستائش کی ہے اور ان کے انتخاب کی داد دی ہے۔ اپنے مضمون کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں کہ:

"قرائن یہ کہتے ہیں کہ غزل نمبر کی پوری ترتیب اور اس کا تقریباً تمام تر انتخاب محمد طفیل نے خود کیا تھا اور وہ یقیناً اس کام کے اہل تھے۔ اگر وہ بقول خود بچپن کی عمر میں غزل کے من پسند اشعار جمع کرنے کے لیے ایک خوبصورت بیاض خرید سکتے تھے تو اس بات پر بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ انھیں عمر بھر غزل کے اشعار سے محبت رہی ہو گی۔ اس محبت کا عملی ثبوت نقوش کا غزل نمبر ہے۔ جس نے عام قاری کو دوبارہ غزل کی طرف مائل کیا اور خواص کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ "غزل" کا دور گزرا نہیں ہے بلکہ غزل اردو شاعری کی واحد صنف ہے جو ہر دور میں مقبولیت کی معراج پر رہی اور آئندہ بھی رہے گی۔" (۳۵)

"پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال: ۱۹۴۷ء۔۱۹۹۷ء" پاکستانی اردو تنقید کے اجمالی جائزے پر مشتمل ہے۔ جس میں انھوں نے اختصار مگر باریک بینی سے پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سالہ سفر کا جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون کا اختتام اس بات پر ہوتا ہے کہ انھیں اردو میں کسی بڑے نقاد کا انتظار ہے۔ اسی تسلسل میں ہم "پاکستان میں اردو نظم کے پچاس سال: ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۷ء" کو زیر بحث لا سکتے ہیں۔ اس مضمون

میں انھوں نے بہت زیادہ اختصار سے کام لیا ہے اس لیے پڑھنے والے کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی تنقید کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دلچسپی کا بنیادی موضوع اردو شاعری ہے۔ ابتدا میں ان کا زیادہ رجحان کلاسیکی شعرا کی طرف تھا لیکن آگے چل کر انھوں نے جدید اردو شاعروں کو بھی اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ ہم تحقیق کے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے داغ اور حالی کے دیوان مرتب کیے ہیں۔ اکبر الہ آبادی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کرنے کے ساتھ ساتھ اکبر کی نثر کو مرتب بھی کیا ہے۔ کلاسیکی شعرا اور جدید شعرا کے درمیان بیسویں صدی کے عظیم اردو شاعر اقبال آتے ہیں۔ اب ہم اقبال پر لکھی گئی ان کی تنقید کا جائزہ لیتے ہیں جسے ہم نے تنقید اقبال کا عنوان دیا ہے۔

تنقید اقبال

خواجہ محمد زکریا کی علمی اور تحقیقی زندگی کا ایک موضوع ابتداء سے تا حال رہا ہے اور وہ علامہ محمد اقبال کی فکر اور ان کی شاعری ہے۔ انھوں نے اقبال کے بہت اہم شعری مجموعے "بال جبریل" کی بہت عمدہ اور سہل شرح بعنوان "تفہیم بال جبریل" تحریر کی ہے اور اس کی اشاعت اول ۲۰۰۲ء میں ہوئی۔ ۲۰۱۳ء میں اس کی دوسری اور ۲۰۱۹ء میں اس کی تیسری اشاعت سامنے آئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کی اس شرح کو قارئین کی طرف سے پذیرائی بھی مل رہی ہے۔

علامہ اقبال کے حوالے سے ان کی تالیفی زندگی کا آغاز تو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہو گیا تھا۔ فکر اقبال کے حوالے سے ان کے دو مضامین "نئے پرانے خیالات" میں بھی شامل تھے۔ پاکستان میں 1977ء کا سال اقبال کی صد سالہ پیدائش کے حوالے سے منایا گیا۔ اس موقع پر خواجہ محمد زکریا نے اقبال کے حوالے سے اپنی تحریروں کو "اقبال کا ادبی مقام" کے نام سے شائع کیا۔ اگلے چند سالوں میں اس کے تین ایڈیشن فروخت ہوئے۔ ۲۰۰۱ء میں انھوں نے اقبالیات کے حوالے سے لکھے گئے مزید مضامین کو "اقبال کا ادبی مقام" کے ساتھ یکجا کر کے شائع کیا۔ چند اضافوں کے ساتھ یہ کتاب ۲۰۰۷ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔

علامہ اقبال سے اپنی دلچسپی اور زیر نظر کتاب کے حوالے سے خود انھوں نے "ابتدائیہ" میں لکھا ہے:

"اقبال کے کلام سے میری دلچسپی کا آغاز بچپن ہی سے ہو گیا تھا اور آج تک شغف کم نہیں ہو سکا۔ کلام اقبال کو بار بار پڑھنے کی وجہ سے اس کی بعض ایسی خصوصیات بھی میرے سامنے ہیں جن کی طرف اہل

نقد ونظر نے عام طور پر توجہ نہیں دی خصوصاً میں نے کلامِ اقبال کی فنی پہلوؤں کی طرف جو اشارے بعض جگہ کیے ہیں وہ تکرار کی ذیل میں نہیں آتے..... غالباً یہی اس کتاب کی اشاعت کا جواز ہے۔"(۳۶)

خواجہ محمد زکریا کی تنقیدی کتابیں پڑھتے ہوئے قاری کے لیے ایک سہولت اس طرح پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مضامین کا سنِ اشاعت عموماً مضمون کے آخر میں درج کر دیتے ہیں جس سے مضمون کے سیاق وسباق کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ ان کی کتابوں کے مختلف ایڈیشن ساتھ رکھ کر موازنہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ مسلسل اپنے لکھے میں ترمیم واضافہ کرتے رہتے اور طباعتی اغلاط کی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ یہ خوبی بھی ہمارے ہاں کم نقادوں میں پائی جاتی ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری اور فکری سوچ سے ان کی دلچسپی کا پہلا ثبوت 1965ء میں ملتا ہے جب انھوں نے "اقبال اور فسطائیت" تحریر کیا۔ یاد رہے کہ یہ مضمون خواجہ محمد زکریا کے تنقیدی مجموعہ "نئے پرانے خیالات" مطبوعہ ۱۹۷۰ء میں بھی شامل تھا۔ یہ مضمون خاص طور پر ترقی پسند فکر رکھنے والے نقادوں اور دانشوروں کی اقبال کے بارے میں پھیلائی ہوئی ایک غلط فہمی کے ازالے کے لیے لکھا گیا تھا کہ اقبال کو "فسطائی" قرار دیا جائے۔ اس کی ابتدا اختر حسین رائے پوری کے ایک مضمون سے ہوئی تھی جو اس وقت چھپا جب انگریز برصغیر پر قابض تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں روس کے زیرِ اثر ہندوستانی ترقی پسند انگریز سرکار سے مکمل تعاون کر رہے تھے۔ اس وقت اقبال کو فسطائیت پسند قرار دینے کے پیچھے شاید انگریز کی خوشنودی بھی شامل تھی۔ ایسا نہیں کہ تمام ترقی پسند اقبال کو فسطائیت کا حامل خیال کرتے تھے۔ آل احمد سرور اور بعض دوسرے لوگوں نے اس کی تردید کی تھی مگر اختر حسین رائے پوری اپنی رائے پر قائم رہے اور اسے بار بار دہراتے رہے۔ یاد رہے کہ اختر حسین رائے پوری کا مضمون "ادب اور انقلاب" بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں لکھا گیا تھا جس میں انھوں نے اقبال کو فسطائیت کا علمبردار کہا تھا۔ خواجہ محمد زکریا نے اپنے زیرِ نظر مضمون میں اقبال کے بارے میں اس نقطۂ نظر کو مدلل انداز میں اور عقلی تجزیے سے اقبال کے کلام سے مثالیں دیتے ہوئے رد کیا ہے۔

"اقبال اور اشتراکیت" کے عنوان سے ان کے دو مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 1968ء کا تحریر کردہ ہے اور دوسرا اس کے دس سال بعد کا۔ اپنے اس مضمون میں خواجہ محمد زکریا نے بڑی عرق ریزی سے اقبال کی شاعری اور نثر سے وہ ثبوت اکٹھے کیے ہیں جن سے اقبال کی اشتراکیت سے ذہنی اشتراکات پر روشنی پڑتی ہے۔ خواجہ صاحب مانتے ہیں کہ اقبال کو اشتراکیت سے دلچسپی تھی اور اس نے اشتراکیت کی بعض

باتوں کو قبول بھی کیا ہے اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

"اقبال کی اشتراکیت سے دلچسپی کے کچھ اسباب نفسیاتی ہیں۔ اقبال دنیا کی تاریخ قوموں کے عروج و زوال اور اس کے اسباب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ خصوصاً نئی تحریکیں انھیں متوجہ کرتی تھیں۔ ان کا ذہن ایک محدود فضا میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ یکسانیت سے وہ جلد اکتا جاتے تھے۔" (۳۷)

خواجہ محمد زکریا علامہ اقبال کی فکر اسلام سے محبت اور اس کے اثرات کا واضح ادراک رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اقبال نے جہان بھر کی فکری خاک چھانی اور جہاں سے انھیں ایسی باتیں ملیں جو اسلامی عقائد سے نہیں ٹکراتی تھیں اقبال نے انھیں قبول کر لیا۔ اقبال بنیادی طور پر "سوشل ڈیموکریسی" یا روحانی جمہوریت کے قائل تھے۔ اقبال نے ۱۹۳۷ء میں قائداعظم کے نام اپنے ایک خط میں سوشل ڈیموکریسی کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ خواجہ صاحب اپنے زیرِ نظر مضمون میں حنیف رامے کی اس غلطی کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو "نصرت" میں اس خط کا ترجمہ شائع کرتے ہوئے کی گئی۔ سوشل ڈیموکریسی کو حنیف رامے نے اسلامی اشتراکیت کر دیا۔ خواجہ محمد زکریا اپنے مضمون کا اختتام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی اسلامی حدود کو مدنظر رکھتے ہوئے اقتصادی ڈھانچہ ایسا بنانا پڑے گا جو اشتراکیت سے ملتا جلتا ہو۔ افسوس اقبال نے تفصیل نہیں دی اور نہ ہی خط اس کا متحمل ہو سکتا تھا۔ شاید انھوں نے یہ بات اقتصادیات کے ماہرین پر چھوڑ دی ہو۔ بہرحال اس سے اتنا تو ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ وہ اشتراکیت کے اقتصادی نظام کو اسلام کے مطابق ڈھال کر اپنانے کے حامی ہیں۔" (۳۸)

دوسرا مضمون لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جب خواجہ محمد زکریا کا پہلا مضمون نصرت میں چھپا تو خواجہ صاحب کے مضمون میں جو اقبال کے خط کا انگریزی متن تھا اس کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے حنیف رامے نے اس کا ترجمہ "اسلامی اشتراکیت" کر دیا۔ یہ بات نہ تو اقبال نے کہی تھی اور نہ ہی خواجہ محمد زکریا اس بات کے داعی تھے۔ سہو کاتب نے کیا سے کیا کر دیا اور خواجہ محمد زکریا کو ایک اور مضمون لکھ کر اپنے موقف کی وضاحت کرنا پڑی۔

زیرِ نظر کتاب میں شامل دوسری طرح کے مضامین وہ ہیں جن میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اقبال کا موازنہ ان کے سینئر معاصرین جیسے سرسید احمد خان اور اکبر الہ آبادی سے کیا ہے۔ سرسید احمد کی فکر کے ساتھ اقبال کا دوگانہ تعلق تھا۔ انھوں نے سرسید کی بعض باتوں سے اتفاق اور بعض باتوں سے اختلاف کیا تھا۔ ابتداء میں وہ سرسید کی مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے روشناس کروانے کو قابلِ تحسین عمل سمجھتے تھے۔ وہ

اس میں چھپے مضر اثرات کا بھی ادراک رکھتے تھے۔ اس لیے سرسید کی حکمتِ عملی کی مزید توسیع کو بدلتے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لیے مضر خیال کرتے تھے۔

اقبال، اکبر آلہ آبادی کے نوجوان ہم عصر تھے۔ بہت سے فکری اور قومی معاملات پر دونوں میں اتفاق پایا جاتا تھا اور ان کے شاعرانہ اظہارات میں بھی مماثلتیں موجود ہیں۔ یہ یقیناً اقبال پر اکبر الہ آبادی کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ اکبر اور اقبال کی شاعری کے موازنے سے خواجہ محمد زکریا یہ درست نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''اقبال کے ہاں اور بھی بہت سے نظریات ہیں جن کے رشتے اکبر کے خیالات سے جا ملتے ہیں۔''(۳۹)

''قاآنی اور اقبال'' میں اقبال کی شاعری پر قاآنی کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ قاآنی انیسویں صدی میں ایران کے نہایت اہم شاعر گزرے ہیں۔ قاآنی غالب کے ہم عصر تھے اور اقبال یہ خیال کرتے تھے کہ ''ایرانی شاعری کا قاآنی پر خاتمہ ہو گیا ہے''۔ خواجہ محمد زکریا نے قاآنی کے بانگِ درا کی نظموں پر گہرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے خاص طور پر ''میں اور تو'' کے چار پانچ اشعار نقل کر کے جیسے

می نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
می حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری

نقل کیا ہے اور اس نظم کے فنی رموز کی وضاحت کر کے قاآنی سے قبول کیے جانے والے اثرات کو واضح کیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

''اس نظم کی بحر بے حد رواں ہے مگر اس کو اور زیادہ تیز اور تند بنانے کے لیے داخلی قافیوں کا سہارا لیا گیا ہے، پہلے شعر میں بنیادی قافیے (دلبری) کے علاوہ برابر وقفوں میں داخلی قافیے (گلو، بو، آرزو) استعمال ہوئے ہیں، دوسرے شعر میں داخلی قافیوں کی تعداد اور زیادہ کر دی گئی ہے۔ غم، ہم، ہم، عدم، حرم، عجم، چھ داخلی قافیے ہیں۔ علاوہ ازیں مرہ مرالا مرمری میں ''م'' اور ''ر'' کی تکرار آہنگ کی تیزی میں اضافہ کر رہی ہے۔ یہی کیفیت تیسرے شعر کی ہے۔ چوتھے شعر میں داخلی قافیوں میں ''م'' اور اس کے ساتھ ساتھ ''ر'' کی تکرار ڈھول کی تیز تھاپ سے مشابہ ہے۔''(۴۰)

جیسا کہ زیرِ نظر کتاب میں شامل مضامین سے عیاں ہوتا ہے کہ خواجہ محمد زکریا اقبال کی شاعری پر فکری اور فنی دونوں حوالوں سے بات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کسی بھی شاعر اور ادیب کو فنی اور فکری دونوں حوالوں سے سمجھ کر ہی اس سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے اور اس کی حیثیت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ محمد زکریا اپنے مضمون ''اقبال کا ادبی مقام'' کا آغاز اس سوال سے کرتے ہیں کہ ''اقبال'' کا ادبی مقام کیسے

متعین ہوگا۔ اقبال کی فکر سے یا فن سے۔ اس حوالے سے دو مکاتب فکر ہیں۔ ترقی پسند نقاد فکری کو سب کچھ جانتے تھے اور جمالیاتی نقاد فنی محاسن کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ خواجہ محمد زکریا اس نقطۂ نظر کا اظہار ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں۔

"میرے خیال میں دونوں نظریات جزوی صداقت کا اظہار کرتے ہیں۔ کسی نظریاتی وابستگی سے نہ کوئی شخص بڑا شاعر بن سکتا ہے اور نہ ہی عام خیالات رکھنے والا شخص محض جمالیاتی اصولوں کی پابندی کرکے بڑا شاعر کہلانے کا اہل ہو سکتا ہے۔ بلند اور گہرے خیالات کا اسالیب کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا ہی کسی شخص کو عظیم شاعر بنا سکتا ہے۔"(۳۱)

اپنے مندرجہ بالا ادبی معیار پر خواجہ محمد زکریا دیگر شعرا کے ساتھ ساتھ اقبال کو بھی پرکھتے ہیں۔ وہ کلام اقبال کے فنی محاسن کو سمجھتے اور سراہتے ہیں وہ فکر اقبال کی درست تفہیم کرتے اور اس کا رشتہ اقبال کے جمالیاتی تجربے سے ملاتے ہیں۔ یوں وہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام سے مختلف مثالیں پیش کرکے اقبال کے ادبی مقام کے بارے میں مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"اسی طرح کے بے شمار اشعار اور نظموں کے متعدد ٹکڑے جن کو میں نے طوالت کے خوف سے نقل نہیں کیا۔ اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ اقبال محض حکیم، فلسفی یا متکلم نہیں بلکہ ایک حساس شاعر ہیں۔ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ شاعری کا کام محض دقیق خیالات لوگوں تک پہنچانا نہیں ہے بلکہ خیالات کو ایک زندہ تجربہ بنا دینے کا کام ہے۔ سچی شاعری وہ ہوتی ہے جسے پڑھتے ہوئے آپ کا ذہن خیالات سے مرعوب نہ ہو بلکہ یہ محسوس کرے کہ ایک زندہ اور تازہ تجربے سے گزر رہا ہے۔ خارجی مظاہر رفتہ رفتہ انسان کے حواس کو کند کر دیتے ہیں۔ روزانہ ایک ہی قسم کے مظاہر و مناظر پیش نظر رہیں تو ان میں کسی تازگی، کسی نئے پن اور کسی چونکا دینے والی کیفیت کا احساس باقی نہیں رہتا۔ جو شاعر ان مظاہر و مناظر کو ہمارے حواس کے لیے دوبارہ ایک تازہ تجربہ بنا دے وہ زندہ شاعر ہے اور اقبال میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔"(۳۲)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خواجہ محمد زکریا اقبال کے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے ان کے کلام کے فنی محاسن اور فکر دونوں کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ایسا وہ صرف اقبال کے حوالے سے ہی نہیں کرتے بلکہ جن جن شعرا پر انھوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ جیسے نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، علامہ محمد اقبال، مجید امجد اور ن۔ م۔ راشد سب کی شاعری کو اسی تنقیدی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ اس سے ہمیں ایک بات کا بھی اندازہ

ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب اپنی نظری تنقید میں جن معیارات کا تعین کرتے ہیں جب وہ عملی تنقید کی طرف آتے ہیں تو ان کا اطلاق اپنے زیر مطالعہ شعرا پر کرتے ہیں یوں ان کی نظری تنقید اور عملی تنقید ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔اسی طرح وہ کسی بھی شاعر کے کلام سے جو مثالیں منتخب کرتے ہیں وہ بھی اعلیٰ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ یہ خوبیاں خواجہ محمد زکریا کو ان نقادوں سے بالکل جدا کر کر دیتی ہیں جو نظری معیارات بہت اچھے بنا لیتے ہیں مگر جب عملی اطلاق کا مرحلہ آتا ہے تو درست اطلاق نہیں کر پاتے اور ان نقادوں سے بھی ممتاز کرتی ہیں جو اچھے تنقیدی معیارات تو قائم کر لیتے ہیں مگر جب متن سے مثالیں ڈھونڈنے کا مرحلہ آتا ہے تو نہایت پست درجے کے اشعار منتخب کرتے ہیں۔

انھوں نے "اقبال کی قطعہ نگاری" پر مضمون 1961ء میں تحریر کیا اور ابتداء میں یہ ان کے ایم۔اے کے تحقیقی مقالے "اردو میں قطعہ نگاری" کا حصہ تھا جسے بعد میں ترمیم و اضافے کے بعد "اقبال کا ادبی مقام" میں شامل کیا گیا خواجہ صاحب اقبال کی قطعہ نگاری کے بہت معترف ہیں اور اقبال کے قطعات کا فنی اور فکری جائزہ لینے کے بعد اقبال کی قطعہ نگاری کے بارے میں درجہ ذیل نتیجا خذ کرتے ہیں:

"غرض اقبال کے قطعات تعداد کے لحاظ سے سوائے ابن یمین کے ہر اردو اور فارسی شاعر سے زیادہ ہیں۔معیار بھی بلند ہے۔طویل اور مختصر قطعات میں انھوں نے بعض تجربات بھی کیے ہیں۔رباعی نما قطعات کو انھوں نے ایک خاص مقام دیا ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قطعات میں کہیں غیر ضروری تفصیل کا شکار نہیں ہوئے۔یہی وجہ ہے کہ اشعار کی تعداد عموماً دس سے کم ہی رہتی ہے۔مضامین بھی بڑے متنوع ہیں اور سوائے عشقیہ مضامین کے تقریباً ہر وہ مضمون ان میں آ گیا ہے جو آج تک ہمارے قطعات میں شامل تھا یہ بات قابل ذکر ہے کہ انھوں نے مادی اور جسمانی عشق کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا پاں عشق مقاصد پر قطعات لکھے ہیں۔ان خصوصیات کی بناء پر اقبال کو اردو کے بہترین قطعہ نگاروں میں اہم مقام حاصل ہے۔"(۴۳)

اب تک اقبال سے متعلق خواجہ محمد زکریا کے جن مضامین پر بات کی گئی ہے وہ چالیس، پچاس سال پہلے کی تصانیف ہیں۔اب ہم ان کے ایک دو ایسے مضامین پر بات کریں گے جو اکیسویں صدی میں تحریر کیے گئے ہیں۔اس سلسلے میں پہلا مضمون "فکرِ اقبال کا بنیادی خیال" ہے۔اس مضمون میں خواجہ محمد زکریا نے فکرِ اقبال کے مرکز کو دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

"میری دانست میں اقبال کی بنیادی فکر یہ ہے کہ یہ ہر لحظہ بدلتی، ٹیکنیکل، سائنسی اور تکنیکی ترقیات کے ساتھ رم کرتی ہوئی دنیا میں ہر علاقے اور ہر معاشرے کے لوگ اپنا اپنا قومی اور ملی تشخص برقرار رکھتے ہوئے کس طرح زندہ اور آسودہ رہ سکتے ہیں؟ انھوں نے عمومی طور پر دنیا بھر کے انسانوں کے امن، سکون، خوشحالی اور آسودگی کے بارے میں غور کیا ہے، لیکن چوں کہ ان کا تعلق ایک خاص علاقے اور خاص ملت سے ہے اس لیے انھوں نے اپنی سوچ کا خصوصی حوالہ اس علاقہ اور ملت کو بنایا ہے لیکن درحقیقت اس کے ذریعے سے انھوں نے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے ایک کامل و مکمل نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"(۴۴)

اقبال کی فکر کے اس مرکزی نقطے کو دریافت کرنے کے بعد وہ یہ اعلان ہرگز نہیں کرتے کہ اقبال ایک فلسفی ہیں۔ بلکہ وہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اقرار اس طرح کرتے ہیں کہ اقبال نے اپنی فکر کو اپنی شاعری کے ذریعے دنیا تک پہنچایا، وہ لکھتے ہیں:

"اقبال کا اصل Medium یا ذریعہ اظہار شاعری ہے اور وہ اپنے تمام دقیق، اہم اور زندہ خیالات شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ شاعری کی ایک اپنی زبان ہے جو نثر سے مختلف ہے۔ چوں کہ اقبال ایک فطری شاعر ہیں اس لیے جب وہ اظہار خیال کرتے ہیں تو شاعری کے تمام وسائل ان کے کلام میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور یوں ان کے خیالات نہایت دلنشیں ہو جاتے ہیں۔"(۴۵)

علامہ اقبال کی شاعری اور فکر کے بارے میں اردو ادب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بعض دفعہ تو گمان گزرتا ہے کہ بہت کچھ اضافی اور دہرانے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس کے باوجود اگر اقبال کو بہ نظر غور پڑھا جائے تو اس میں سے کچھ نہ کچھ نیا مل ہی جاتا ہے۔ اس حوالے سے خواجہ محمد زکریا کے اقبال کے حوالے سے مضامین میں بہت کچھ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں میں صرف ان کے ایک مضمون کا حوالہ دینا ضروری خیال کرتا ہوں وہ ہے ان کا مضمون "کلام اقبال میں خود احتسابی کی تلقین" اپنے مطالعے کے حوالے سے میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ موضوع خواجہ محمد زکریا ہی کا تلاش کردہ ہے۔ اگر آپ خواجہ محمد زکریا کے مضمون کے عنوان کو ذہن میں رکھیں تو آپ کو اقبال کی شاعری سے اس کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔ خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں کہ:

"اقبال کی نظم و نثر کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے ملت اسلامیہ کے دین و دنیا کو سنوارنا اور پھر ملت اسلامیہ کے توسط سے دنیا بھر کی اقوام و ممالک کے افراد کی زندگیوں کو بہتر بنانا۔"(۴۶)

ظاہر ہے اقبال جو مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے وہ خود احتسابی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی شاعری میں اپنی قوم کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ کورانہ تقلید سے منع کرتے ہیں اور اس کی خوابیدہ قوتوں کو جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے علامہ اقبال کی شاعری خواجہ محمد زکریا کی عمر بھر کی دلچسپی کا موضوع رہی ہے۔ زمانہ طالب علمی سے تا حال وہ کلام اقبال کو پڑھتے اور اس کے محاسن اور مفاہیم پر غور و فکر کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اقبال کے حوالے سے لکھی گئی تنقید کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلام اقبال کی جو شرحیں لکھی گئی ہیں وہ بھی ان کی نظر سے گزری ہیں۔ کسی بھی عظیم شاعر یا تخلیق کار کے محاسن و مفاہیم کو کسی ایک کتاب میں کسی ایک فرد کے لیے کلی طور پر سمو دینا ممکن نہیں ہوتا۔ خواجہ محمد زکریا نے اکتوبر 1999ء میں "اقبال" لاہور میں ایک مضمون "بال جبریل کی ایک اور شرح کی ضرورت" لکھا تھا اور علامہ اقبال کے اس انتہائی اہم مجموعے کے حوالے سے لکھی گئی شرحوں کے بارے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے خود "بال جبریل" کی ایک نہایت عمدہ شرح لکھی۔ پہلی بار یہ شرح 2002ء میں بزم اقبال سے شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 2013ء میں بزم اقبال ہی سے شائع ہوا۔ جبکہ تیسرا ایڈیشن 2019ء میں الحمد پبلی کیشنز نے چھاپا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ خواجہ محمد زکریا ان ناقدین میں سے ہیں جو اپنے کام پر مسلسل نظر ثانی کرتے رہتے ہیں اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کے عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر "تفہیم بال جبریل" کے تینوں ایڈیشنوں کا موازنہ کیا جائے تو میری بات کے واضح شواہد آپ کو مل جائیں گے۔

"تفہیم بال جبریل" کے پیش لفظ میں خواجہ محمد زکریا نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ اقبال کے اس نہایت اہم مجموعے کی کم از کم آٹھ شرحیں لکھی جا چکی ہیں اس کے باوجود وہ محسوس کرتے تھے کہ ایک شرح کی ضرورت موجود ہے۔ "تفہیم بال جبریل" سے قبل جن آٹھ شرحوں کی نشاندہی ہوتی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

-1	شرح بال جبریل	یوسف سلیم چشتی
-2	سرود سلسبیل	اختر جالندھری
-3	مطالب بال جبریل	غلام رسول مہر
-4	شرح بال جبریل	عبدالرشید فاضل

-5	شرح بالِ جبریل	اسرار زیدی
-6	شرح بالِ جبریل	عارف بٹالوی
-7	مدحتِ پرواز	فیض لدھیانوی
-8	بالِ جبریل: مطالب و شرح	الف۔ د۔ نسیم

خواجہ محمد زکریا نے ان شرحوں کا مطالعہ اور تقابل نہایت عرق ریزی سے کیا اور اس کے بعد انھوں نے جو نتیجہ اخذ کیا اس کی وضاحت "تفہیم بالِ جبریل" کے پیش لفظ میں درج ذیل الفاظ میں کی:

"مذکورہ بالا آٹھ شرحوں میں یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر کی کاوشیں نسبتاً بہتر ہیں۔ تاہم دونوں میں توازن کی کمی ہے۔ چشتی کے ہاں بعض اشعار کی وضاحت بڑی عالمانہ ہے مگر بعض مشکل اشعار کو بالکل سرسری انداز میں نپٹا دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بعض توضیحات غیر ضروری طول کلامی کی ذیل میں آتی ہیں۔ مہر کے ہاں طول کلامی تو کہیں نہیں مگر اختصار اس قدر ہے کہ وضاحتیں تشنگی کا احساس دلاتی ہیں۔" (۴۷)

کسی بھی کلام یا فن پارے کی شرح لکھنا دراصل اسے عام قاری کے لیے عام فہم بنانا ہوتا ہے۔ شاعر اپنے کلام میں بہت سی تشبیہات، رموز و علائم اور علامات کا استعمال کرتے ہیں۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر قاری ان سب کے سیاق و سباق، اور معنی اور مطالب سے واقف ہو۔ اس کے علاوہ جب کلامِ اقبال کا جائزہ لیا جاتا ہے تو مشکلات دو چند ہو جاتی ہیں۔ اقبال ایک بہت وسیع المطالعہ شخص تھے۔ ہمارے عہد کے نہایت نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے اس طرف بہت واضح اشارہ کر رکھا ہے کہ اقبال کم از کم دنیا کی پانچ بڑی ادبی روایات سے شناسا اور ان سے فیض حاصل کرنے والے فرد تھے۔ ان میں عربی ادب، فارسی ادب، سنسکرت ادب، انگریزی کے حوالے سے مغربی ادب اور اردو ادب شامل ہے۔ ظاہر ہے ہر قاری اتنا وسیع المطالعہ نہیں ہوتا لہٰذا کلامِ اقبال کی بار بار شرح لکھنے کی ضرورت محسوس کی جاتی رہتی ہے۔ علامہ محمد اقبال کے اردو کلام میں "بالِ جبریل" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اور بعض حوالوں سے اس کا شمار اقبال کے مشکل ترین اردو مجموعے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ "تفہیم بالِ جبریل" لکھ کر خواجہ صاحب نے ایک اہم علمی اور ادبی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ وہ اپنی شرح کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میں نے کوشش کی ہے کہ توازن قائم کیا جائے لیکن توازن کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے چشتی اور مہر کے بین بین رہنے کی کوشش کی ہے بلکہ حسبِ ضرورت وضاحت یا اجمال سے کام لیا ہے۔ بعض

اشعار کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے باقی شارحین سے اختلاف بھی کیا ہے لیکن استدلال کے بغیر نہیں۔" اقرار واداکرن کے سلسلے میں اختصار مگر جامعیت سے کام لیا گیا ہے۔ مشکل الفاظ اور تراکیب کی وضاحت کے لیے حتیٰ الامکان ان مشکلات اور ابہامات کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے اور اپنی دانست میں کسی الجھن کو سلجھائے بغیر نہیں چھوڑا گیا۔ پھر بھی میری اس کوشش کی افادیت یا عدم افادیت کا حتمی فیصلہ قارئین کو کرنا ہے۔" (۴۸)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ خواجہ محمد زکریا نے اپنی زیرِ نظر شرح کے لیے کن معیارات کو مدِ نظر رکھا ہے اور کن باتوں سے گریز کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شرح نگاری کے جو معیارات بتائے ہیں وہ ہر معیاری شرح لکھنے کے لیے ضروری ہیں اور "تفہیم بالِ جبریل" کے قاری کو اس وقت زیادہ خوشی ہوتی ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے معیارات کی کم و بیش ہر جگہ پابندی کی ہے اور یہ یقیناً ایک قابلِ ستائش بات ہے۔

"بالِ جبریل" کا آغاز غزلیات سے ہوتا ہے۔ خواجہ محمد زکریا جب غزل کے اشعار کی تشریح کرتے ہیں تو سب سے پہلے مشکل الفاظ کے معنی تحریر کرتے ہیں۔ پھر شعر کا مفہوم بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد شعر کی فنی خوبیوں کا احاطہ کرتے ہیں اور جہاں ضروری ہو وہاں وہ ماقبل کے شارحین سے اپنے اختلاف یا اتفاق کا حوالہ بھی دے جاتے ہیں۔

"بالِ جبریل" کے سرورق پر علامہ اقبال کا درج ذیل شعر درج تھا۔

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر پیدا کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

خواجہ محمد زکریا اس شعر کی تشریح کچھ یوں کرتے ہیں:

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان قوم اس دور میں تھکی تھکی معلوم ہوتی ہے اس کی سانس پھولی ہوئی ہے۔ اب اسے تازہ دم ہو کر جدوجہد کے لیے نکلنا چاہیے۔ اقبال کہتے ہیں: اے ملتِ اسلامیہ کے فرزند! اٹھو اور خورشید تک پہنچنے کی تیاری کرو تمھاری منزل ستاروں سے بھی بلند ہے۔ دنیا میں تھک ہار کر نہ بیٹھ جاؤ۔ بلندیوں کے سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔

"اس شعر کو سرورق پر اس لیے درج کیا گیا ہے کہ اس سے کلامِ اقبال کے بنیادی مقصد کی طرف قاری فوراً متوجہ ہو جائے اور جدوجہد کے لیے آمادہ ہو۔

"جعفر علی اثر نے اپنی کتاب "چھان بین" میں لکھا ہے کہ پہلے مصرع میں لفظ "اٹھ" معنویت کی جان ہے۔ اس لفظ کی صورت اٹھنے اور تیار ہونے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسے تبدیل کر کے کوئی اور لفظ رکھ دیا جائے تو شعر کی فصاحت دم توڑ دیتی ہے۔"(۴۹)

خواجہ محمد زکریا نے غزل کے اشعار کی تشریح کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ نہایت مناسب اور موزوں ہے۔ اس طرح وہ صرف اقبال کے اشعار کی تشریح ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قاری کے ذہن اور ذوق کی تربیت بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں میں اقبال کے ایک اور مشہور شعر کی تشریح کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ اس شعر کا مفہوم اور لب و لہجہ جدید ذہن کو بہت متاثر کرتا ہے۔ پہلے میں اقبال کا شعر درج کروں گا اور اس کے بعد خواجہ محمد زکریا کی تشریح:

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

خواجہ محمد زکریا اس شعر کی تشریح کچھ یوں کرتے ہیں:

"یہ شعر اس غزل کے مزاج سے ہٹا ہوا ہے۔ بہر حال یہ غزل کا عیب نہیں ہے۔ کیوں کہ ابتدا ہی سے صنف غزل میں ریزہ خیالی عام ہے" اس شعر میں اقبال خدا سے گلہ گزار ہیں کہ اس نے انسان کو بہشت کے باغ سے نکال کر دنیا میں پھینک دیا۔ دنیا میں بے شمار مسائل ہیں جن کی وجہ سے لوگ لا تعداد الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ کوئی انسان ایسا نہیں جس کی مصروفیات اسے دنیا کے کاموں سے اتنی فرصت دے کہ وہ خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔ دراصل انسان مر کر ہی دنیا کے دھندوں سے فارغ ہوتا ہے۔ اس لیے اب خدا کو اس بات کا طویل انتظار کرنا پڑے گا کہ کب انسان فارغ ہو اور کب اس کی طرف رجوع کرے۔ شعر میں اشارہ یہ ہے کہ یہ انتظار ہر انسان کی موت تک رہے گا بقول حالی۔

دنیا میں فراغت کا اگر ہے بھی کوئی دن
وہ دن ہے کہ جس دن ہے اسے چھوڑ کے جانا (۵۰)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خواجہ صاحب نے کس خوبی سے مندرجہ بالا شعر کی تشریح کر کے اس کے مفہوم کو واضح کیا اور پھر بات کی مزید وضاحت کے لیے حالی کا ایک شعر بھی درج کر دیا۔ ظاہر ہے حالی کا شعر فنی اعتبار سے اقبال کے شعر سے بہت پیچھے ہے لیکن یہاں مطلوب فنی معیار کا نہیں بلکہ مفہوم کی وضاحت ہے۔ اقبال کے اس شعر نے لکھنے والوں کی ایک پوری نسل پر اثرات مرتب کیے ہیں حتیٰ کہ اردو ادب میں

سب سے بڑی ناول نگار قرۃ العین حیدر نے اپنی طویل سوانح کا نام "کارِ جہاں دراز ہے" رکھا ہے۔

"تفہیم بال جبریل" میں ہمیں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں جنھیں ہم اچھی تشریح کے طور پر نقل کر سکتے ہیں لیکن یہاں اس کی گنجائش ہے نہ ضرورت۔ مقصود یہ تھا کہ قاری کو بتایا جائے کہ خواجہ صاحب کس خوبی سے اقبال کی غزل کے اشعار کی تشریح کرتے ہیں۔ اب ہم آتے ہیں "بال جبریل" میں شامل رباعیات کی جانب۔ رباعیات کی تشریح کے لیے خواجہ محمد زکریا نے کم و بیش وہ طریقہ کار اختیار کیا ہے جو پہلے غزل کے اشعار کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی پہلے مشکل الفاظ کے معنی درج کیے جائیں اور پھر پوری رباعی کی تشریح اور مفہوم بیان کیا جائے۔ "بال جبریل" میں علامہ اقبال کی رباعی کی تشریح وہ کچھ یوں کرتے ہیں

پریشاں کاروبارِ آشنائی | پریشاں تر مری رنگیں نوائی
کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذتِ وصل | خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی

خواجہ محمد زکریا اس رباعی کی تشریح کچھ یوں کرتے ہیں۔

"کاروبارِ آشنائی: محبت کے معمولات، جذبۂ محبت

"اس دوبیتی میں یہ بتایا گیا ہے کہ عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو عاشق کے دل کو پریشان کیے رکھتا ہے اور اسے کسی پہلو بھی چین نہیں لینے دیتا۔"

"اقبال کہتے ہیں کہ محبت عاشق کے لیے پریشانی کا باعث بن جاتی ہے اور چوں کہ میں عاشق ہوں اس لیے میری شاعری میں جذبات کا انتشار دکھائی دیتا ہے۔ میں ہجر کے دوران محبوب کے وصل کی لذت ڈھونڈتا ہوں اور وصل کے دوران مجھے لگتا ہے کہ میری محبت کم ہو جائے گی چناں چہ میں محبوب سے جدا ہو کر زیادہ خوشی محسوس کرتا ہوں کیوں کہ جدائی میرے دل میں سوز و گداز کا بیش قیمت جذبہ پھر سے پیدا کر دیتی ہے۔" (۵۱)

غزل اور رباعی کے بعد خواجہ محمد زکریا جب اقبال کی منظومات کی طرف آتے ہیں تو وہ اپنے طریقہ کار میں تھوڑی سی تبدیلی کرتے ہیں جو میرے خیال میں اصناف کے مزاج اور طریقہ کار کے اختلاف کی وجہ سے ضروری تھی۔ نظم کی تشریح میں وہ سب سے پہلے نظم کا مفہوم یا سیاق و سباق درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد نظم کا بنیادی خیال تحریر کرتے ہیں۔ اس کے بعد مشکل الفاظ کی وضاحت کرتے ہیں۔ اور پھر باعتبار شعر یا بند، جو بھی صنف کی ہیئت ہو تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے قاری صرف

بالِ جبریل کی ابتدائی نظموں "دعا" اور "مسجد قرطبہ" کی تفہیم بالِ جبریل میں شامل شرح کو پڑھ کر میری رائے کی تصدیق کر سکتا ہے۔ "بالِ جبریل" خواجہ محمد زکریا کی شرح پڑھ کر قاری اقبال کے مفاہیم تک زیادہ بہتر رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ شعرِ اقبال کی تفہیم کی ذہنی اور جمالیاتی تربیت پا سکتا ہے اور اقبال کی دیگر اُردو شاعری کی کتب کو سمجھنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں خواجہ محمد زکریا کی تفہیم "بالِ جبریل" اقبالیات میں ایک بہت عمدہ اضافہ ہے۔

مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ خواجہ محمد زکریا کے تنقیدی کام کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے تنقیدی طریقہ کار اور تنقیدی خوبیوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی تنقید کا موضوع زیادہ تر شاعری اور تنقید کو بنایا ہے۔ جن لوگوں کو ان سے اُردو داستان، اُردو ناول اور اُردو افسانے پر بات کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان اصناف کے اعتبار سے بھی ان کا ذوق اعلیٰ پائے کا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور ان کا تجزیہ بڑا انوکھا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اُردو شاعری اور تنقید کے ساتھ ساتھ اُردو فکشن کو بھی اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بناتے۔

حواشی

۱۔ محمد زکریا، خواجہ، اردو کی قدیم اصناف شعر، لاہور اکیڈمی، لاہور، س۔ن (ص: ۱۹۳)
۲۔ ایضاً ص: ۲۰۳
۳۔ ایضاً ص: ۲۱۶
۴۔ ایضاً ص: ۲۲۷
۵۔ ایضاً ص: ۲۳۳
۶۔ ایضاً ص: ۲۴۷
۷۔ ایضاً ص: ۲۹۰
۸۔ ایضاً ص: ۲۹۳
۹۔ ایضاً ص: ۲۹۸
۱۰۔ ایضاً ص: ۳۰۳
۱۱۔ ایضاً ص: ۳۰۷
۱۲۔ ایضاً ص: ۳۰۹
۱۳۔ محمد زکریا، خواجہ، نئے پرانے خیالات، لاہور اکیڈمی، لاہور، ستمبر ۱۹۷۰ء، ص: ۷
۱۴۔ ایضاً ص: ۷۔۸
۱۵۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، پیش لفظ، مشمولہ نئے پرانے تصورات، لاہور اکیڈمی لاہور ستمبر ۱۹۷۰ء، ص: ۹
۱۶۔ ایضاً ص: ۲۱
۱۷۔ محمد زکریا، خواجہ، نئے پرانے خیالات، لاہور اکیڈمی، لاہور، ستمبر ۱۹۷۰ء
۱۸۔ ایضاً ص: ۴۳
۱۹۔ ایضاً ص: ۱۱۵
۲۰۔ ایضاً ص: ۱۱۰
۲۱۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، پریم چند کے بہترین افسانے (مرتبہ)، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص: ۲
۲۲۔ محمد زکریا، خواجہ، نئے پرانے خیالات، لاہور اکیڈمی، لاہور: ۱۹۷۰ء
۲۳۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، نئے پرانے خیالات، لاہور اکیڈمی، لاہور: ۱۹۷۰ء، پس سرورق۔
۲۴۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، چند اہم جدید شاعر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص: ۹
۲۵۔ ایضاً ص: ۱۰
۲۶۔ ایضاً ص: ۲۷
۲۷۔ ایضاً ص: ۲۸

۲۸۔ ایضاً،ص:۳۵
۲۹۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، کتاب میرا اقبال عدم، الحمد پبلی کیشنز، لاہور
۳۰۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، چند اہم جدید شاعر، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص:۵۹
۳۱۔ ایضاً،ص:۷۳
۳۲۔ ایضاً،ص:۸۰
۳۳۔ ایضاً،ص:۱۶۴
۳۴۔ ایضاً،ص:۲۲۵
۳۵۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، نقوش کا غزل نمبر، مشمولہ "تاثراتی اور تنقیدی تحریریں" مرتبہ آصف علی بلوچ، ڈاکٹر، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص:۲۵۳
۳۶۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، "تاثرات: تنقیدی جہات، مخزن علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۱ء، لاہور، ص: ۷-۸
۳۷۔ ایضاً،ص:۴۳
۳۸۔ ایضاً،ص:۵۳
۳۹۔ ایضاً،ص:۷۱
۴۰۔ ایضاً،ص:۸۵
۴۱۔ ایضاً،ص:۸۹-۹۰
۴۲۔ ایضاً،ص:۹۹
۴۳۔ ایضاً،ص:۱۰۷
۴۴۔ ایضاً،ص:۹-۱۰
۴۵۔ ایضاً،ص:۱۱
۴۶۔ ایضاً،ص:۱۸
۴۷۔ محمد زکریا، پروفیسر ڈاکٹر خواجہ، تفہیم بال جبریل (تیسرا ایڈیشن) الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2019ء، ص:۱۵
۴۸۔ ایضاً،ص:۱۵
۴۹۔ ایضاً،ص:۱۷
۵۰۔ ایضاً،ص:۲۹
۵۱۔ ایضاً،ص:۲۰۸

باب چہارم

خواجہ محمد زکریا کی شاعری

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا بنیادی تعارف تو ادب کے استاد، نقاد، محقق اور مرتب کا ہے لیکن شاعری کی طرف ان کا مزاج شروع سے ہی مائل رہا ہے۔ اپنی ابتدائی عمر کے تجربات اور کیفیات بیان کرتے ہوئے وہ بار بار اپنے بچپن کے ان واقعات کو دہراتے ہیں جو شاعری سے ان کے مزاج کی مناسبت کی جانب اشارہ کرتے ہیں اپنے اولین شعری مجموعے "آشوب" کے دیباچے "در مدح خود۔۔۔۔" کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"قدرت نے مجھے شاعر پیدا کیا تھا لیکن حالات تحقیق و تنقید کی طرف لے آئے۔"(1)

اس کے بعد انھوں نے اس اجمال کی تفصیل اپنے حالاتِ زندگی کے بیان سے دی ہے۔ ان کا بچپن اور لڑکپن جھنگ میں گزرا۔ سکول میں وہ بیت بازی میں خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں بھی انھیں بہت سے شعرا کا کلام یاد تھا جسے وہ درست تلفظ اور وزن میں اپنے کلاس میں پڑھا کرتے تھے۔ یہاں سے رفتہ رفتہ ان کی ذات میں تخلیق کا سوتا پھوٹنے لگا۔ انھوں نے بچوں کی شاعری سے آغاز کیا اور ان کی تخلیقات بچوں کے رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ انھوں نے خود لکھا ہے:

"دسویں جماعت میں تھا جب میری شاعری بچوں کے رسالوں تعلیم و تربیت اور کھلونا وغیرہ میں شائع ہونے لگی۔ چند اخباروں میں بچوں کے صفحوں میں بھی میری نظم و نثر شائع ہوتی تھی۔(۲)

خواجہ محمد زکریا اپنے بچپن اور لڑکپن کے حالات یاد کرتے ہوئے اپنے اساتذہ اور دوستوں کا تذکرہ بہت محبت سے کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ شیر افضل جعفری نے ابتدائی ایام میں ان کی بہت حوصلہ افزائی کی اور اس وقت جھنگ میں شاعروں کی ایک کہکشاں آباد تھی۔ ان میں جعفر طاہر، جابر علی سید، پروفیسر تقی انجم اور نوجوانوں میں صفدر سلیم سیال، رام ریاض، نذیر ناجی اور عباس اطہر وغیرہ شامل ہیں۔

مجید امجد رہتے تو جھنگ سے باہر تھے مگر عید، شب برات پر جھنگ آتے اور دوستوں کے ساتھ

ادبی محفلیں سجاتے۔ یہ وہ ادبی اور شاعرانہ فضا تھی جس نے ان کی موزوں طبیعت میں نکھار پیدا کیا اور جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے آنرز (فارسی) کے طالب علم بنے تو اس کالج کی ادبی اور تہذیبی فضا نے ان میں مزید نکھار پیدا کیا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں انھوں نے اُردو آپشنل مشہور شاعر اور ادیب قیوم نظر سے پڑھی اور وہی انھیں حلقہ اربابِ ذوق لاہور میں لے کر آئے۔ اس دوران ان کا کلام ''کالج میگزین'' ''راوی'' میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ راوی ان دنوں سہ ماہی چھپتا تھا۔ یہاں ہم خاص طور پر راوی کے شمارہ مارچ ۱۹۵۹ء، دسمبر ۱۹۵۹ء، جون ۱۹۶۰ء، اپریل ۱۹۶۳ء کا حوالہ دے سکتے ہیں جن میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ (۳) پروفیسر عشرت سلطانہ نے اپنے مقالے میں خواجہ صاحب کی ''ذاتی بیاض'' کا ذکر بھی کیا ہے۔ مگر میرے استفسار پر خواجہ صاحب نے بتایا کہ ایسی کوئی بیاض موجود نہیں۔ عشرت سلطانہ سے شاید سہو ہوا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عشرت سلطانہ نے اپنا مقالہ خواجہ صاحب کے اولین شعری مجموعے ''آشوب'' کی اشاعت سے پہلے مکمل کیا تھا اس لیے ''آشوب'' کے یہ جمع شدہ کلام کو انھوں نے ''ذاتی بیاض'' کا نام دے دیا ہو۔ ''راوی'' کے بعد دوسرا رسالہ جس میں ان کا شعری کلام شائع ہوا وہ ''تخلیق'' ہے۔ ''تخلیق'' کے شمارہ ۱۹۹۹ء میں ان کی شاعری شائع ہوئی ہے۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۰ء تک کا ہے۔

زمانہ طالب علمی میں ان کا زیادہ رجحان شاعری کی جانب تھا اور اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔ اے اُردو کرنے کے دوران کالج میں خورشید رضوی، انور مسعود، عابد صدیقی، اسلم انصاری اور انور انجم جیسے شاعر موجود تھے۔ ان کی صحبت کے باوجود ان میں شعری تحریک مدھم پڑتی چلی گئی۔ خواجہ صاحب رقمطراز ہیں۔

''اس فضا میں مجھے بھی شعر گوئی کی تحریک ہوتی تھی مگر میں ایک آدھ شعر کہہ کر اسے لکھتا نہیں تھا تاکہ غزل یا نظم کی تکمیل کی طرف توجہ نہ ہو جائے اور امتحان کی تیاری پر برا اثر نہ پڑے۔ چند مہینوں کے بعد تحریکِ شعر مدھم پڑ گئی۔ ایم۔ اے میں اوّل آیا اور نیا ریکارڈ قائم کیا لیکن شاعری چھوٹ گئی۔ (۴)

انھوں نے اپنے شعری مجموعے ''آشوب'' کے دیباچے ''در مدحِ خود'' میں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ان کی شادی پسند کی ہے اور شادی سے پہلے انھوں نے کچھ رومانی شاعری بھی کی۔ ان کی زندگی میں محبت کے اولین اور انوکھے تجربے نے شاعری کے شگوفے کو پھر سے کھلایا لیکن شادی ہوتے ہی

شاعری ایک بار پھر پس پردہ چلی گئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"شادی سے ذرا پہلے تھوڑی سی رومانی شاعری کی۔ مجھے قدرت نے رومانی نہیں بنایا۔ لڑکیوں کی اکثریت والا یہ کالج (اورینٹل کالج) مجھے شاعری کی طرف واپس نہ لا سکا۔" (۵)

ایسا نہیں ہے کہ خواجہ صاحب کی شخصیت میں رومانویت کا عنصر نہیں ہے۔ وہ جس طرح شاعری اور موسیقی کو پسند کرتے ہیں ایک قطعی غیر رومانی شخصیت کا حامل شخص ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت میں رومانوی اور کلاسیکی عناصر، دونوں موجود ہیں۔ والدین کی تربیت نے ان کے اندر کلاسیکی عنصر کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ ضبط ان کی شخصیت کا اہم وصف ہے۔ وضع داری اور رکھ رکھاؤ ان کی فطرت ثانیہ ہیں۔ ان عناصر نے ان کے رومانوی پہلو کو دبا دیا ہے۔

"آشوب" کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ "آشوب حالات" جس کی ابتداء میں ان کے دور ثانی کا کلام شامل ہے۔ اور آخر میں "انقلاب عراق"، "دور مسعود"، "دعویٰ" اور "رباعیات" دور اوّل سے یادگار ہیں۔ "آشوب ذات" میں زیادہ تر کلام ان کی شاعری کے دور اوّل سے یادگار ہے۔ ہم بات کا آغاز ان کے پہلے شعری مجموعے کے دوسرے حصے سے کرتے ہیں۔ "آشوب ذات" کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے۔

"حسین وہ ہے جسے دل کہے حسین ہے یہ
نہ حسن روئے درخشاں نہ کاکل پیچاں" (۶)

مندرجہ بالا شعر ہمیں خواجہ صاحب کے تصور حسن سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ حسن کو ایک موضوعی تجربہ سمجھتے ہیں اور حسن کے معروضی ہونے کو رد کرتے ہیں۔ خود راقم نے بھی ادب اور جمالیات کا جتنا مطالعہ کیا ہے اس کے بعد یہی نتیجہ نکالتا ہے کہ حسن اور جمال انسان کے موضوعی تجربات ہیں۔ انہیں معروضی پیمانوں پر کم ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ آشوب میں شامل نظم "کہاں تھیں تم" ان کے اولین محبت کے تجربے کی غماز معلوم ہوتی ہے۔

کہاں تھیں تم

اچانک کل اسے دیکھا تو میرا دل پکار اٹھا
یہی صورت ہے جس کو ڈھونڈتا تھا میں ہمیشہ سے
مری جانب جو بھی دیکھا

اچانک دو ستارے ہو گئے روشن
تو میری نیم وا آنکھیں بھی حیرت سے چمک اٹھیں
کہا میں نے
کہاں تھیں تم؟
تو وہ بولی
یہیں تھی میں
مگر تم ہی نہیں تھے...... دو برس پہلے
تو دل بولا کہ ہوتا کاش یہ چالیس سے بھی دو برس پہلے (۷)

نظم بالکل صاف ہے لیکن آخری مصرعے کا یہ ٹکڑا "تو دل بولا کہ ہوتا کاش یہ چالیس سے بھی دو برس پہلے" کچھ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ کہیں یہ شادی کے برسوں بعد کسی نئی محبت کے تجربے کی طرف تو اشارہ نہیں۔ کیوں کہ نظم پر سن تخلیق درج نہیں اس لیے کچھ یقین سے کہنا مشکل ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے ابتدائی دور شاعری کے بارے میں ہمارے پاس زیادہ معلومات موجود نہیں مگر ایک ایسا حوالہ موجود ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حوالہ مزدور شاعر احسان دانش کا ہے جنھوں نے اپنی سوانح عمری "جہانِ دانش" کے دوسرے حصے "جہانِ دگر" میں ان کی شاعری کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

"جناب زکریا جب جھنگ میں تھے، بڑی اچھی غزلیں کہتے تھے۔ وہ ملک کے بہترین شاعر ہوتے لیکن جب سے وہ اورینٹل کالج کی ملازمت میں آئے ہیں، اس وقت سے ان کی کوئی غزل سننے میں نہیں آئی۔ جہاں انھیں مضمون نگاری میں یدِ طولیٰ حاصل ہے، وہاں ان کی غزلیں بھی معیاری غزلوں کی صف میں آتی ہیں اور ان کے پاس غزلوں کا اچھا خاصا ایک مجموعے کا مواد ہو سکتا ہے لیکن ادھر ان کا رجحان ہی معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اب تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہیں اور ادھر بھی ان کا ایک وقیع مقام ہے اور صلاحیتیں محدود نہیں۔ وہ نوجوان ہیں زندگی کے ہنگامے اور کامیابیاں ان کی منتظر ہیں۔ (۱۹۹۹ء)

احسان دانش جیسے شاعر نے ان کی جن غزلوں کی تعریف کی ہے ان میں شاید یہ غزل بھی شامل ہے جو محبت کے رومانوی تجربے کو بیان کر رہی ہے اور شاعر اپنے محبوب سے نہایت لطیف انداز میں مخاطب ہے۔ اگرچہ یہ ایک مصرعہ طرح پر لکھی گئی ہے لیکن شاعر کا رنگ ڈھنگ اپنا ہے۔

تو آج مجھ سے دور سہی میرے پاس ہے
پھیلی ہوئی ہواؤں میں تیری ہی باس ہے
لطف و سرور تو نے دیا مجھ کو اس قدر
"ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے"
جو میرا انتخاب ہے، جو ہے مری پسند
خوش رو ہے، خوش خصال ہے اور خوش لباس ہے
دوری کے دن کٹھن ہیں مگر کٹ ہی جائیں گے
ہو گا نصیب قرب مجھے اس کی آس ہے
دیکھا ہے خواب میں نے کہ باغِ ارم میں ہوں
ہلکی ہوا ہے، پھول ہیں، تو میرے پاس ہے
مجبور ہو کے چھوڑ رہا ہوں تمھارا شہر
لیکن اسی کی آب و ہوا مجھ کو راس ہے(۹)

اپنی اگلی غزل میں انھوں نے ایک ایسے تجربے کو گرفت میں لیا ہے جو آج کل کی جواں نسل تو شاید کم محسوس کرتی ہو لیکن ہماری نسل تک، جب تک کھلے صحن یا گھر کی چھت پر سونے کا رواج تھا یا ایک نہایت رومانوی تجربہ تھا۔

میں نے سوچا تم بھی چاند کو دیکھ رہی ہو گی اس وقت
رات کو بستر پر لیٹے لیٹے جب میں نے دیکھا چاند"(۱۰)

رومانوی تجربے کے ساتھ ساتھ اس میں ایک نہایت فکری پہلو بھی ہے اور یہ پہلو زمان و مکان کا معاملہ ہے جس سے اہلِ دانش آگاہ ہیں۔

اس شعر کے دو کردار عاشق اور محبوب دو مختلف مقامات پر دکھائے گئے ہیں لیکن وقت کی ڈور نے انھیں ایک تجربے سے جوڑ دیا ہے۔ شاید اس طرح شاعر اپنے احساسِ تنہائی پر بھی قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس غزل کے آخری شعر میں شاعر نے زمان و مکاں کی یکتائی کے اس تجربے کو حال سے مستقبل میں منتقل کر دیا ہے۔

ہم جب بھول چکے ہوں گے اک دوسرے کو یاد آئیں گے پھر
مدت بعد بھی آسمان پر جب چمکے گا پورا چاند(۱۱)

اہل فکر اور اہل احساس اس دنیا میں متضاد کیفیات اور جذبات سے بھی معاملہ کرتے ہیں۔ خدا باری تعالیٰ کی ذات کے بارے میں فلسفیوں نے بھی شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے اور شاعروں نے بھی۔ انسان آج تک اس بات کا حتمی جواب مہیا نہیں کر سکا کہ خدا موجود ہے یا نہیں۔ خواجہ زکریا صاحب اپنے شعر میں یوں اپنی تشکک کا اظہار کرتے ہیں!

عجیب بات ہے لب پر مرے دعا بھی ہے
مگر میں سوچ رہا ہوں کہیں خدا بھی ہے (۱۲)

وہ خدا کی ذات کے بارے میں سوال کرتے ہوئے اپنے ارد گرد موجود ناانصافی اور جبریت کو بنیاد بناتے ہیں۔

تو ہے عادل مگر تیری دنیا میں کیوں
کوئی مسرور ہے کوئی رنجور ہے (۱۳)

ہیں نیک گرفتار گنہ گار کھلے ہیں
انسان مقید ہیں مگر مار کھلے ہیں (۱۴)

دنیا کے کاروبار میں جب دخل ہی نہ دے
خواجہ گلہ کریں تو کریں کیا خدا سے ہم (۱۵)

باوجود اس کے کہ شاعر غزل میں دنیا جہاں کے مضامین بیان کرتے ہیں لیکن غزل کا خمیر محبت کے تجربے سے اٹھا ہے۔ محبت کے جذبے کی تپش ہی شاعری کو جلا بخشتی ہے۔ اولین سطح پر یہ عشق مجازی کا تجربہ ہے جو آگے چل کر عشق حقیقی کے روپ میں بھی ڈھل سکتا ہے اور نہیں بھی۔ کم از کم ہمارے عہد میں تو یہ تجربہ عشق مجازی تک ہی محدود رہتا ہے۔ خواجہ زکریا کی شاعری میں بھی محبت کا تجربہ عشق مجازی کا تجربہ ہے اور ان کا محبوب ارضی محبوب ہے جس کی اداؤں سے وہ متاثر بھی ہوتے ہیں اور جس کے جلوؤں کی وہ تعریف بھی کرتے ہیں۔

تن اجلا اجلا ریشم و کمخواب کی طرح
چہرے پہ جس کے آج بھی رنگ بہار تو (۱۶)

اس طرح کوندی کوئی برق جمال
یوں ہوا محسوس گویا مر چلے (۱۷)

کہیں کہیں تو ان غزلوں میں ایک ایسا جمالیاتی تجربہ ملتا ہے کہ قاری کی زبان سے بے اختیار واہ نکل جاتی ہے اور ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کیوں ترک کی۔

تھی محویت کمال مگر اس کے باوجود
کیا جلد چونک اٹھتے تھے آواز پا سے ہم (۱۸)

میں دیکھتا ہوں انکھیوں سے جب اسے خواجہ
تو لوٹ جاتی ہے اس کی نگاہ دزدیدہ (۱۹)

وہ رشک مہر و ماہ ہے جب سے نگاہ میں
تابش رہی ہے مہر میں باقی نہ ماہ میں
میں رفتہ رفتہ ہار گیا قلب و عقل و جاں
محسوس بھی نہ ہوا تھا پہلی نگاہ میں (۲۰)

خواجہ صاحب نے اپنے عشقیہ تجربے کو بہت ضبط اور سلیقے سے بیان کیا ہے۔ وہ کسی جگہ بھی اپنے عشق کے تجربے کو بے لگام نہیں ہونے دیتے نہ جذبات کی رو میں بہتے ہیں۔ ان کے ہاں اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف تو ہے لیکن وہ محبوب کے جسمانی حسن سے زیادہ وہ حسن کے موضوعی تجربے کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔

تنہائی انسان کا بنیادی تجربہ ہے۔ شاعر بطور حساس فرد کے اس تنہائی کے مظہر کو زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ خواجہ صاحب نے بھی اپنی شاعری میں انسان کے اس ازلی و ابدی تجربے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی کئی غزلوں میں تنہا یا تنہائی کو بطور ردیف بھی استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نے اپنے مضمون "آشوب" پر چند سطریں میں "آشوب ذات" میں شامل شاعری کے حوالے سے بہت خوب تجزیہ کیا ہے:

"خواجہ صاحب کی شاعری اور فکر کا دوسرا رنگ جسے خواجہ صاحب نے آشوب ذات کا عنوان دیا ہے ہم پر خواجہ صاحب کی شخصیت کا داخلی پہلو منکشف کرتا ہے۔ اس حصے میں ہمیں گداز دل رکھنے والی ایک اداس شخصیت ملی ہے۔ (Photographic Images) مناظر اور ان سے خواجہ صاحب کی ذات پر مرتب ہونے والے اثرات، ان کی دور بینی بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی شاعری میں شام، پھیلتا اندھیرا، تنہائی، اداسی اور جگہ جگہ اپنی ذات اور پسند و ناپسند کا تجربہ ملتا ہے۔ اس حصے میں

ایک اداس شخص سے ملاقات ہوتی ہے۔ آشوبِ حالات اور آشوبِ ذات دونوں میں پائے جانے والے رنگ کے باہمی امتزاج سے ہی خواجہ صاحب کی ذات مکمل ہوتی ہے۔"

"اداسی خواجہ صاحب کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے جو آشوب کی شاعری میں واضح ہو کر سامنے آیا ہے۔ یہ اداسی تنہائی کی پیدا کردہ ہے تنہائی خواجہ صاحب کے لیے جان لیوا ہے۔ خواجہ صاحب کے ملنے والے اور دوست احباب جانتے ہیں کہ محفل آرائی انھیں مرغوب ہے۔ بذلہ سنجی اور قہقہوں سے مزین ان محافل میں خواجہ صاحب کا اور ہی رنگ ہوتا ہے۔ یہ اس داخلی تنہائی کا علاج ہے جو خواجہ صاحب کے لیے جان لیوا ہے۔ نفسیاتی نقاد عموماً احساسِ تنہائی کو صنفِ مخالف کی رفاقت و قربت سے محرومی کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ نجی اور عائلی زندگی میں نہایت آسودہ اور مطمئن ہونے کے باوجود خواجہ صاحب تنہائی کیوں محسوس کرتے ہیں؟"

"اس کا جواب ان کے ایک شعر سے ملتا ہے۔ خواجہ صاحب کا شعر ہے:"

"کوئی ساتھی نہیں کسی کا یہاں
ہیں رہِ زیست پہ سبھی تنہا"

"خواجہ صاحب کی عائلی زندگی میں آسودگی کے باوجود تنہائی کا یہ احساس شاید دو اسباب کی بنا پر ہے۔ ایک تو تنہائی گہری روحانی ہے اور دوسرا قیامِ جاپان میں اہلِ خانہ اور دوست احباب سے دوری اور زبان سے ناواقفیت کی بنا پر گرد و پیش میں موجود اکثریت سے گفتگو اور بات چیت کے درمیان حائل خلیج۔"(۲۱)

ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کا طویل اقتباس اس لیے نقل کیا ہے کہ اس میں ہمیں خواجہ صاحب کی شخصیت اور شاعری پر اچھا تجزیہ ملتا ہے۔ انھوں نے خواجہ صاحب کی شاعری کے نہایت اہم پہلو کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اداسی اور تنہائی سے متعلق ہمیں ان کے بہت سے خوبصورت شعر ملتے ہیں۔

کنجِ باغ اور شامِ تنہائی
مجھ کو اس مہ جبیں کی یاد آئی (۲۲)

مجھ کو مجبورِ فکر کرتی ہے
اکثر اوقات شب کی تنہائی

مجھ کو درکار ہے فقط خواجہ
یارِ محبوب و کنجِ تنہائی (۲۳)

جن کو دیکھا نہ تھا کبھی تنہا
اب وہ پھرتے ہیں ہر گھڑی تنہا
کوئی ساتھی نہیں کسی کا یہاں
ہیں رہ زیست پہ سبھی تنہا (۴۴)
کوئی اپنا نہیں تو کیا غم ہے
کٹ ہی جائے گی زندگی تنہا
زندگی کی سیاہ راہوں میں
دل دکھاتا ہے روشنی تنہا (۴۵)

جاپان میں چار سال کا قیام خواجہ محمد زکریا کی تخلیقی زندگی میں ایک نئی رنگت لے کر آیا۔ جاپان کے شب و روز، تنہائی، اپنوں سے دوری اور اردگرد ناشناسا لوگوں کا ہجوم، ایسے میں اپنی ذات سے مکالمہ ہی وجود کی بقا کا واحد ذریعہ رہ جاتا ہے۔ شاعر اور تخلیق کار جب اپنی ذات سے مکالمہ کرتا ہے تو شاعری جنم لیتی ہے۔ وہ جاپان میں اپنی تخلیقی بازآفرینی کے حوالے سے نہایت وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

"میں جاپان کے ایک چھوٹے سے شہر کوماگانے میں رہتا تھا۔ جاپان سارے کا سارا سطح مرتفع ہے۔ ناہموار زمین، اوسط درجہ بلندی کی پہاڑیاں، شام سے پہلے سورج کا پہاڑیوں کے پیچھے چھپ جانا، پھر پہاڑیوں کے پیچھے سے بدلیوں کا اٹھنا اور چوٹیوں کو چھپا لینا، ایسے مناظر معمولات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک روز میں سیر کر کے واپس گھر جا رہا تھا، (اور طویل سیر ہی وہاں میرا واحد مشغلہ تھی) پہاڑیوں کے پیچھے سورج چھپ رہا تھا، ابھی گھر تک نہیں پہنچا تھا کہ اندھیرا پھیلنے لگا اور ایک ایک کر کے لوگوں کے گھروں میں بتیاں جلنے لگیں، اچانک دو مصرعے ذہن میں آ گئے۔

"ایک اور طویل دن کٹا ہے
ایک اور طویل رات آئی

"گھر تک پہنچتے پہنچتے نظم مکمل ہو گئی۔"" "جاپان میں اجنبی" (۴۶) کے زیر عنوان دائتو بنکا یونیورسٹی ٹوکیو کے ایک مشاعرے میں پڑھی اور پسند کی گئی۔
نظم یوں ہے

پھر ایک طویل دن کٹا ہے
پھر ایک طویل رات آئی
کچھ دیر سے ایک ایک کر کے
بستی میں چراغ جل رہے ہیں
رات آئی ہے پھر اداس کرنے
دل کے ساغر میں زہر بھرنے
یخ بستہ سیاہ رات چھائی
کالے پربت کی چوٹیوں پہ
کالا بادل بکھر رہا ہے
کچھ اور اداس کر رہا ہے
کچھ دیر میں ایک ایک کر کے
ہو جائیں گے سب چراغ خاموش
اپنے اپنے گھروں میں سب لوگ
نیندوں کے نشوں میں ہوں گے مدہوش
سو جاؤں گا میں بھی آخر کار
کالے کمبل میں سر چھپائے
کب ایک طویل شب ہو رخصت
کب ایک طویل دن پھر آئے
پھر ایک طویل دن کٹا ہے
پھر ایک طویل رات آئی (۴۷)

جب شاعری کی بازآفرینی ہو چکی تو پھر خواجہ صاحب کا قلم رکا نہیں۔ جدائی کی محبت ساٹھ سال کی عمر کے بعد بار دیگر خواجہ صاحب پر مہربان ہوئی۔ شاید زندگی ایسے ہی ایک دائرے میں سفر کرتی ہے۔ ہم جہاں سے سفر شروع کرتے ہیں واپس اُس مقام کی طرف ضرور آتے ہیں۔ بچپن کا شاعر ایک بار پھر اپنے جلوے دکھا رہا ہے مگر اب شاعری ذات سے زیادہ حالات کا بیان ہے۔ وہ اپنے ارد گرد نگاہ ڈالتے ہیں

اور شدید بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے پاکستان کے نام سے ایک نئی مملکت کو وجود میں آتے دیکھا۔ وہ جانتے ہیں کہ اس نئی مملکت کے ساتھ لوگوں کے کیسے کیسے خواب جڑے ہوئے تھے۔ پیار اور محبت سے زندگی کرنے، عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کا قیام، عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کا قرینہ مگر قیامِ پاکستان کے چند سال بعد ہی یہ خواب چکنا چور ہونے لگے۔ ملک کرپٹ اور بدعنوان اشرافیہ کی گرفت میں آ گیا۔ سول اور ملٹری بیوروکریسی نے جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا اور عام آدمی کی زندگی میں بہتری کی خواہش ایک خواب بن کر رہ گئی۔

"آشوب حالات" میں ہمیں پاکستان کے عام آدمی کی حقیقی تصویر ملتی ہے۔ پاکستانی معاشرے میں حکمرانوں اور عام آدمی کے درمیان خلیج کا وسیع ہوتے جانا، مذہب کو مادی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کرنا اور بہت کچھ۔ اس حصے کا آغاز ایک بے مثال شعر سے ہوتا ہے۔

سوچا تھا جوانی میں ، دنیا کو بدل دیں گے

دنیا نے ہمیں لیکن چپ چاپ بدل ڈالا (۲۸)

ہم میں سے کون ہے جس نے اپنی جوانی میں دنیا کو بدلنے کے خواب نہ دیکھے ہوں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شکست خواب سے دوچار نہ ہوا ہو۔ خواجہ صاحب نے ایک کائناتی تجربے کو نہایت سادگی سے بیان کر دیا ہے۔ یہ شعر سہلِ ممتنع کی بہترین مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ "آشوب حالات" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے کہا ہے کہ

"آشوب" حالات حاضرہ پر ایک حساس شاعر کے داخلی ردِعمل کی شاعری ہے۔"(۲۹)

ڈاکٹر انور محمود خالد اپنے مضمون "خواجہ محمد زکریا کا "آشوب" میں ان کی شاعری کے بارے میں بہت عمدگی سے اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"یحییٰ ملٹری اور سویلین حکمرانوں کے پیدا کردہ ناگفتہ بہ، شرمناک حالات پر کبھی اکبر الٰہ آبادی اور کبھی مولانا ظفر علی خاں کے ذکشن اور لب و لہجہ میں طنزیہ شعری ردِعمل کا اظہار کیا گیا ہے۔"

.....اور بڑی حد تک ان کے مخصوص موضوعات؟ کہیں دو دار اور کہیں یک سطحی منفرد اور کھلے سیاسی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی طرزِ احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔"(۳۰)

ڈاکٹر انور محمود خالد آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ:

"ان اشعار میں کھلم کھلا معاشرے میں موجود ناانصافی، بدامنی، جعل سازی، فریب کاری،

جھوٹ، مکروفریب، خوشامد، اوہام پرستی، ضعیف الاعتقادی، رشوت ستانی، بے رنگی اور بھکاری پن پر جو لعن طعن کی گئی ہے۔ وہ شاعر کے مجروح جذبات و احساسات کی ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کے بھیانک زوال اور قعر ذلت میں بتدریج گرتے چلے جانے کا اعلامیہ بھی ہے۔"(۳۱)

عوام الناس کے چہروں پہ چھائی گہری زردی ہے
نہ کوئی ان کا پرساں ہے نہ کوئی ان کا دوری ہے
بہت سے لوگ ہیں مجبور جرم کشی پر اب
مسلسل ذلت و افلاس نے حالت یہ کر دی ہے(۳۲)

بجا تھا خوف اگر اٹھ بھی جائے گا پردہ
تو پھر بھی ہم پہ مسلط رہے گی پردہ گی
جب اختیار زیادہ ہو اور کم تنخواہ
تو کیوں نہ ہو گی غریبوں کی آبرو ریزی(۳۳)

ترقی کر رہا ہے ان کا لالچ جن کی ملکیت
پلازے ہیں، زمینیں ہیں، محل ہیں، کارخانے ہیں
ہوس ان کی برابر بڑھ رہی ہے، کم نہیں ہوتی
اگرچہ قبضۂ قدرت میں قارون کے خزانے ہیں(۳۴)

کسی حاکم کے سوٹ اور بوٹ امریکہ سے آتے ہیں
غریبوں کے لیے کہنہ لبادے اور گندے ہیں(۳۵)

در و دیوار کو چھو لیں تو لگ جاتے ہیں چھاپے سے
چمکتی وردیاں دلکش ہیں لیکن ہاتھ گندے ہیں(۳۶)

یہاں اب گلہ گو ترس ذلت سائل کو کہتے ہیں
کریں کس سے گلہ سب حکمراں ہی نیک بندے ہیں(۳۷)

تاریک مکانوں کے مکیں پھر بھی ہیں خاموش
روشن ہیں امیروں کے وزیروں کے در و بام(۳۸)

جدھر بھی دیکھیے خاک اڑ رہی ہے
کیا ہے خاکیوں نے سب کو خاکی(۳۹)

مندرجہ بالا اشعار کو ملاحظہ کریں۔ ان میں شاعر پاکستان کے حالات حاضرہ پر اپنے تخلیقی ردعمل کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ طنز سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ ان کے لہجے میں ہمیں اکبر الہ آبادی اور مولانا ظفر علی خاں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ لیڈروں کی خوش حالی اور عام آدمی کی غربت کا موازنہ کرتے ہیں۔ وہ جمہوری سیاست دانوں اور فوجی آمروں ہر دو کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے لہجے میں کہیں کہیں تلخی در آتی ہے۔ شاعر ایک خواب دیکھنے والا فرد ہوتا ہے خواب اور حقیقت کے ٹکراؤ سے شکست خواب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شکست خواب مایوسی اور تلخی دونوں پیدا کرتا ہے۔ یہ دونوں عناصر ہمیں "آشوب حالات" کی تخلیقات میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے وقت خواجہ صاحب نو سال کے تھے 1947ء سے 1956ء کے نو سال میں جب یہ ملک رفتہ رفتہ سول اور ملٹری بیوروکریسی کی گرفت میں جا رہا تھا وہ اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کر رہے تھے۔ پہلے مارشل لاء کے وقت وہ بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ 1962ء میں جب وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کر رہے تھے ایوب خان اپنے اقتدار کے نصف النہار پر تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی 73 سالہ زندگی ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ ایک حساس، باشعور انسان ہیں۔ ملک کی معاشی سیاسی حالات کو وہ کسی سیاسی اور فکری تعصب کے بغیر دیکھتے ہیں۔ وہ تمام شعبہ ہائے زندگی کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ عام طور پر انھیں دائیں بازو سے منسلک کیا جاتا رہا ہے۔ مگر وہ مذہبی اداروں سے وابستہ افراد اور معاملات کو بھی اپنی تنقید میں شامل کرتے ہیں۔ یوں وہ ایک ایسے شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں جو آزاد فکری سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

کیا خوب ہو رہا ہے اس ملک میں یہ دھندہ
چندہ برائے مسجد، مسجد برائے چندہ (۴۰)

جو شخص الفت دنیا سے بے نیاز نہ ہو
پڑھے ہزار نمازیں مگر نماز نہ ہو (۴۱)

خواہ قبر سے مانگے خواہ اہل قرآں ہو
کوئی یہ نہ چاہے گا حاکم اس کا شیطاں ہو (۴۲)

لیڈر تو بہت سے ہیں نہیں کوئی مسیحا
کیوں نزع کی حالت میں نہ ہو عالم اسلام (۴۳)

نیکیوں کی بھی خدا توفیق دے

آپ کا کتنا مقدس نام ہے(۴۴)

"آشوب" کی شاعری پر غور کیا جائے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کی ساری توجہ اپنی بات کو صاف اور شفاف انداز میں بیان کرنے پر ہے وہ شعری محاسن سے کم کام لیتے ہیں اور بیانیہ پیرائے کو زیادہ اختیار کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حافظ صفوان محمد رضوان نے اپنے مضمون "اردو شاعری کی رسومیات۔ ایک پاکستانی اور محاسن کلام خواجہ" میں اس جانب جا بجا اشارہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"خواجہ صاحب بنیادی طور پر Descriptive (بیانیہ) شاعر ہیں، وہ اصطلاح/علامت لانے کی بجائے مفہوم بیان کرنے اور سمجھانے کو ترجیح دیتے ہیں:(۴۵)

خواجہ محمد زکریا شاعری کے فنی لوازمات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ وہ زبان و بیان کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اُردو اور فارسی کی شعریات اور شعری روایت کا جیسا مطالعہ ان کا ہے ہمارے عہد میں کم لوگوں کا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں مبادیات شعر کے حوالے سے آپ کو کوئی کمی یا خامی نظر نہیں آئے گی۔ وہ شعوری طور پر ان معاملات کو زیادہ خود پر طاری نہیں کرتے بلکہ وہ سہل ممتنع سے کام لیتے ہوئے اپنی شاعری کو سب لوگوں کے لیے قابل فہم بنانے پر توجہ دیتے ہیں۔

خواجہ زکریا صاحب اس حوالے سے بھی ایک خوش قسمت تخلیق کار ہیں کہ ان کے پہلے شعری مجموعے "آشوب" کے بارے میں بہت سے نامور لکھنے والوں نے مضامین لکھے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں ظفر اقبال اور ڈاکٹر انور سدید سے لے کر انور محمود خالد اور صدیق الطہر تک بہت سے لوگ شامل ہیں۔ آشوب پر لکھے گئے 19 مضامین اور پانچ تاثرات کو "خواجہ محمد زکریا کی شاعری": نقطۂ نظر کو کتابی صورت میں مدون کیا گیا ہے۔ اس میں پروفیسر منظور مرزا اور ڈاکٹر امجد پرویز کے لکھے دو انگریزی تبصرے بھی شامل ہیں۔ ظفر اقبال ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کتاب میں خواجہ صاحب کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ مبسوط پیش لفظ میں انھوں نے اپنی شعری سفر کا حال بیان کیا ہے چوں کہ وہ شعر کے نقاد بھی ہیں اس لیے لفظ کی رمز آشنائی میں بھی کمال حاصل ہے۔ ان کے کلام میں تاثیر بھی ہے اور تازگی بھی۔ معاشرے پر گہری تنقیدی نظر رکھتے ہیں اور بات کو بے تکلف ادا کرنے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔(۴۶)

ہمارے عہد کے نامور شاعر اور بے باک نقاد شفیق احمد خاں "آشوب" پر اپنے مضمون "لمحہ موجود

کی شاعری" میں لکھتے ہیں۔

"خواجہ صاحب کی کتاب "آشوب" محض ایک شعری مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ اس ستر سالہ تاریخ کے المیوں کی ایک ایسی دستاویز ہے جسے ایک حساس دل نے تحریر کیا ہے اور یہ تمام سوچنے اور محسوس کرنے والوں کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔" (۴۷)

علی اصغر عباس کا شمار بھی عہدِ حاضر کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے وہ اپنے مضمون "ڈاکٹر خواجہ زکریا کا آشوب" میں ان کی شاعری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"ڈاکٹر خواجہ زکریا کے اس مجموعے کے محرک ہیں وہ حالات و واقعات اور حادثات جو وقتاً فوقتاً رونما ہو کر ہماری قومی زندگی کو بری طرح متاثر کرتے رہے ہیں اور مسلسل کیے جا رہے ہیں۔ پے در پے پیش آنے والے ان حادثات نے ہماری سیاسی و معاشی صورتِ حال کو تباہ و برباد ہی نہیں کیا بلکہ ہمارے معاشرتی ڈھانچے کو بھی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا ہے، ہمارے سماجی رویوں کو یکسر تبدیل کر دیا ہے اور یہ تبدیلی بھی منفی انداز میں رونما ہوئی۔ مثبت انداز میں نہیں۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا نے اس تبدیلی کے اثر کو قبول کرنے کے کرب کا اظہار بڑے عمدہ پیرائے میں یوں کیا ہے:

سوچا تھا جوانی میں دنیا کو بدل دیں گے
دنیا نے ہمیں لیکن چپ چاپ بدل ڈالا" (۴۸)

"آشوب" کے حوالے سے مندرجہ بالا اقتباس دینے کا مقصد یہ ہے کہ قاری عہدِ حاضر کے اہم شاعروں اور نقادوں کے خواجہ محمد زکریا کی شاعری کے بارے میں خیالات اور تصورات سے آگاہ ہو سکیں۔ "آشوب" کی شاعری میں شاعر ہمیں پورے پاکستان کی جھلک دکھاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ وہ پاکستان کی سیاسی و معاشرتی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو اپنا موضوع نہیں بناتے نہ لوگوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ تو رویوں اور رجحانات پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ اشارے کنائے میں بات کرتے ہیں براہِ راست نام لینے سے گریز کرتے ہیں لیکن اپنے شعر میں ایسے نشان چھوڑ جاتے ہیں کہ عقل مند قاری ان کے "ممدوح" تک پہنچ سکتا ہے اور اگر نہ بھی سمجھے تو اس جمالیاتی حسنِ بیان سے ضرور لطف لیتا ہے جو "آشوب" کی شاعری میں جا بجا موجود ہے۔ آخر میں ہم "آشوب" میں شامل ایک نظم "پاکستانی بوڑھوں کا ترانہ" کے آغاز اور اختتام کے بند نقل کر کے اپنی بات کو ختم کرتے ہیں:

"ہم ہیں پاکستانی بوڑھے ہم نے بنایا پاکستان
ہم نے بنایا پاکستان اور ہم نے چلایا پاکستان
پاکستان بنایا ہم نے سب نے خوب کمایا
سب نے خوب کمایا اور مل جل کر سب نے کھایا
کوئی نہیں ہے مفلس سب کی پلٹ گئی ہے کایا (۴۹)
چاہے کبھی پی سی سے منگائی یا چھ سات سموسے
پاکستان کا دوست نہیں جو ہم کو اس پر کوسے
یار ہیں اپنے سید، چودھری، ملک، میاں اور کھوسے
ہم ہیں پاکستانی بوڑھے ہم نے بنایا پاکستان
ہم نے بنایا پاکستان اور ہم نے چلایا پاکستان

آشوب کی اشاعت سے خواجہ صاحب کے تخلیقی سوتے مزید رواں ہوئے۔ 2017ء سے 2018ء تک کے عرصے میں انھوں نے 60 شعری تصانیف کو اپنے دوسرے شعری مجموعے "افتاد" کے زیرِ عنوان اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ عنوان کے حوالے سے انھوں نے اقبال کا ایک مصرع "اس چمن میں اک معیشت اور سو افتاد ہے" درج کیا ہے جس سے شعری مجموعے کی نام کی معنویت زیادہ آشکار ہوتی ہے۔ انھوں نے کتاب کے دیباچے "زندگی ایک اور سو افتاد" میں اپنی شاعری کے حوالے سے بعض بہت اہم نکات کی جانب اشارے کیے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے میں "آشوب حالات" اور "آشوب ذات" کے دو عنوانات قائم کیے گئے تھے۔ زیرِ نظر مجموعے میں حصہ غزلیات کے لیے انھوں نے منظوم و مقفّی کی اصطلاح استعمال کی ہے اور نظموں کے لیے "منظومات" کا عنوان قائم کیا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کو منظوم و مقفّی کا عنوان کیوں دیا اس کی وضاحت کتاب کے دیباچے میں موجود ہے۔ دراصل خواجہ صاحب ایک بالغ نظر اور صاحب ذوق فرد ہیں۔ انھوں نے اُردو شاعری اور فارسی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ وہ شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں اپنی تخلیقات کے لیے انکسار کا عنصر بھی موجود ہے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے وہ اپنی شاعری کو منظوم و مقفّی سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے اپنی شاعری میں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اور جہاں تک شعری پابندیوں میں محصور رہ

کر سکتا ہوں، اچھی حالات کی جزوی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے.... اور اب جب کہ اپنے جیسے چند باقی ماندہ افراد کی طرح تیزی سے زندگی کی اننگز کے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ زندگی رائیگاں چلی گئی ہے میری شاعری اسی رائیگانی کا نوحہ ہے۔"(۵۱)

اپنی شاعری کے حوالے سے وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"میری شاعری کو سب سے بڑا حربہ طنز ہے۔ اکبرالہ آبادی کی شاعری کا میں زبردست مداح ہوں۔ ان کے ہاں شدت جذبات کے ساتھ زور تخیل بھی موجود ہے۔ اس لیے ان کے ہاں طنز میں مزاح کی متناسب آمیزش ہے۔ میری قوت تخیل مقابلۃً بہت کمزور ہے۔ اس لیے مجبوراً میں نے زیادہ تر طنز سے کام لیا ہے تاہم اکبر سے متاثر ہونے کے باوجود میں نے موضوعات کا دائرہ اپنے عصری مسائل تک پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ سادگی بیان اور تحقیق الفاظ کا طرز میں نے حالی سے سیکھا ہے جن کی شاعری آرائش سے مبرا ہے۔ یگانہ چنگیزی سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ ایک ہی لفظ حسب ضرورت شاعرانہ اور غیر شاعرانہ ہو سکتا ہے۔"(۵۲)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے ہمیں خواجہ محمد زکریا کے شعری رویوں اور شاعری کے بارے میں ان کے تصورات سے آگاہی ہوتی ہے۔ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ کس شاعر سے کیا سیکھا ہے جبکہ اس بات کی وضاحت انھوں نے آگے چل کر کی ہے انھوں نے اپنے دو پسندیدہ ترین شاعروں اقبال اور مجید امجد سے اپنی شاعری کو دور رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وضاحت ہم اوپر کر آئے ہیں کہ وہ زیادہ تر خارجی حالات کی وجہ سے رائیگانی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے میں ایک عنصر تنہائی کا بھی ہے۔ مگر دوسرے مجموعے کا سب سے نمایاں عنصر رائیگانی بلکہ زیادہ درست الفاظ میں اجتماعی اور قومی رائیگانی ہے۔ قومی زندگی کے ایسے واقعات اور سانحات ان کی توجہ اپنی جانب کھینچتے ہیں اور وہ جب اس ملک کے قیام سے وابستہ عام آدمی کی توقعات کو ٹوٹتا دیکھتے ہیں تو فوجی آمروں اور جمہوری غاصبوں دونوں کی مذمت کرتے ہیں۔ پاکستان کے حالات کے حوالے سے وہ بہت واضح ہیں کہ اس ملک کی ایک محدود اقلیت نے خوب لوٹ مار کی ہے اور غالب اکثریت نہ صرف بنیادی حقوق سے محروم رہی ہے بلکہ اس نے تو ڈھنگ سے اپنے جائز مطالبات کے لیے آواز بھی بلند نہیں کی۔ اس کتاب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

جو کھٹی ہیں انھیں مبارک باد
زندگی ایک اور سو افتاد(۵۳)

اس غزل کے آخری دو شعر ہمیں اور ڈھنگ سے اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں کہ ان میں ہمیں وقت
کے ساتھ ساتھ ہمارے اجتماعی رویوں میں آنے والی تبدیلیوں کی عکاسی ملتی ہے۔

نت نئے ان سے لے رہا ہوں سبق
میرے شاگرد ہیں مرے استاد
اس سے پہلے تھا ایسا عدل کہاں
ہیجڑے اب ہیں صاحب اولاد (۵۴)

دوسرے شعر میں طنز کی کاٹ آسانی سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ دونوں اشعار میں بیان کی صفائی کے
ساتھ ساتھ مکمل ابلاغ کی موجودگی بھی ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں نمایاں خوبی ہے کہ آپ بغیر رکے اسے
پڑھتے جاتے ہیں اور لطف کی چاشنی قاری کو اپنے اندر محسوس کرتی ہے۔ ان سب خصوصیات کے پہلو بہ پہلو وہ کسی
جگہ اپنے مطالب کو قربان نہیں کرتے۔ ہماری روش عام اور سرکار خاص کی مداخلت پر بے دھڑک اظہار کرتے
ہیں۔ اجتماعی زندگی کی خامیوں کو ہدف تنقید بنانے اور اپنے عہد کی کجیوں کو نمایاں کرنے میں انھیں کوئی باک
نہیں۔ وہ اپنی زندگی میں چاہتے تو ذاتی حوالے سے ارباب اختیار کی قربت حاصل کر کے مادی مفادات اٹھا
سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے نظریات کے تحت زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ ذاتی حوالے سے ہمیں ان کے
ہاں کوئی تاسف نہیں ملتا۔ ساری زندگی کتاب اور علم سے دوستی نے ان کے اندر قناعت اور برداشت کے عناصر کو
پروان چڑھایا ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی میں وہ کسی طرح کا سمجھوتا کرنے پر رضامند نہیں ہیں۔ وہ پاکستان کو عدل
اور مساوات پر مبنی ملک دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مذہبی رواداری اور معاشی برابری کی قدر پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ
انسان کے ہاتھوں انسان پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ ایسے میں ان کا اجتماعی شعور انھیں
ایک ایسے تخلیق کار میں ڈھال دیتا ہے جو پوری قوم کی آواز بن جاتا ہے۔

ہر کوئی چاہتا تھا یہ میرا ہی گھر بچا رہے
جزو بچا رہے تھے ہم ایسے میں کل کا کل گیا (۵۵)

"اقتدا" میں شامل غزلیں پڑھتے ہوئے بعض مرتبہ یہ بہت مشکل معلوم ہوا کہ کس شعر کا حوالہ دیا
جائے اور کسے چھوڑا جائے کہ ہر شعر میں وہ ہماری اجتماعی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر گہری چوٹ لگاتے
ہیں۔ ایک شعر میں اگر وہ ادبی و تہذیبی صورت حال کا نوحہ پڑھتے ہیں تو دوسرے شعر میں ذاتی فائدے
کے لیے بے ضمیری اختیار کرنے کو نشانہ بناتے ہیں تو اگلے شعر میں ہماری سیاسی اور حکومتی طبقوں کے

معاملات میں پیچھے فساد کو آشکار کرتے ہیں۔ ان کی ایک غزل کے چار اشعار ملاحظہ کریں۔

کل سب رواں تھے غالب و اقبال و میر پر
بیٹھے ہوئے تھے جانے والے اخیر پر
خوب آشنا ہیں راز ترقی سے میرے دوست
قربان کیوں نہ ہوں وہ ہر اک بے ضمیر پر
مقصد یہ ہے کہ اور ترقی کرے وطن
وہ اس لیے وزیر ہیں رکھتے وزیر پر
کاگوں کی فوج صرف دکھانے کے واسطے
پر انحصار ہے کسی گورے مشیر پر(۵۲)

اسی طرح کی صورت حال ہمیں ان کی بیشتر غزلوں میں ملتی ہے۔ عام طور پر غزل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ خواجہ محمد زکریا کی ان غزلوں میں یہ خوبی موجود ہے اور احساس کی وحدت غزل کے مختلف اشعار کو ایک لڑی میں بھی پرو دیتی ہے۔ کہیں کہیں ان کی غزل، غزل مسلسل سے پہلو مارنے لگتی ہے۔ ہماری عہد میں اس آہنگ اور ذائقے کی غزلیں کم لوگوں نے کہی ہیں۔ زبان و بیان اور شعری لوازم پر ان کی قدرت، شعر کو بنے بنائے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ آپ بلا اختیار ان کے شعر پڑھتے چلے جاتے اور لطف اٹھاتے چلے جاتے ہیں ایک اور غزل کے یہ چار شعر قاری کے مطالعہ کی نذر

ساحرا یسے کسی طاقت نے بٹھائے ہوئے ہیں
جن کے جادو نے کبھی لوگ سلائے ہوئے ہیں
ان کو اب کچھ تو عوض محنت شاقہ کا ملے
جو پسینے کی جگہ خوں میں نہائے ہوئے ہیں
جتنے ظالم ہیں وہ عم زاد ہیں، نسل ایک ہی ہے
لوگ اسی نسل ہلاکو کے ستائے ہوئے ہیں
خوبیاں دوسروں کی ان کی نگاہوں میں ہیں عجیب
اور عیب اپنے سہولت سے بھلائے ہوئے ہیں(۵۷)

خواجہ محمد زکریا زیادہ تر تو ایمائیت سے کام لیتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں وہ وراپے با کی سے کام بھی لے لیتے ہیں۔ یہاں بھی وہ نام کا وہ حصہ استعمال کرتے ہیں جس میں ذو معنویت موجود ہو۔

اب لوگ آ گئے ہیں شریفوں سے اتنے تنگ
کہتے ہیں اس سے اچھی حکومت کیبن کی (۵۸)

اس میں انھوں نے یا ہی کی ردیف کو اتنی خوبی سے اور اس لفظ میں موجود معنی کی مختلف جہتوں کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کہ ان کی مشاقی پر بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔

تم نہ کچھ مجھ سے کہو اور میں نہ کچھ تم سے کہوں
دونوں لوٹیں اس کو کہتے ہیں بتائے یا ہی
حکمران جب چپ رہیں اک دوسرے کی لوٹ پر
اہل دانش اس کو کہتے ہیں رضائے یا ہی
ان میں تو کوئی اکیلا بھی کسی سے کم نہ تھا
بن گئے ہیں اب تو مل جل کر بلائے یا ہی (۵۹)

اسی تسلسل میں ایک اور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں کہ کس خوبی سے انھوں نے اپنے شعر کے ایک مصرعے میں ایک ڈکٹیٹر اور ایک سیاست دان کے پورے نام استعمال کیے ہیں۔ اس کے بعد کے شعر ایمائیت کا رنگ لیے ہوئے ہیں مگر اشارہ بالکل واضح ہے۔ تیسرے شعر میں انھوں نے ملک کی معاشی حالت کی جو عکاسی کی ہے وہ آج بھی پوری طرح درست ہے۔

سب دیتی ہیں طلب پینا کے سپاہی
پرویز مشرف ہو کہ پرویز الٰہی
کوشش میں ہیں کچھ لوگ کہ وہ لوٹ کے آئیں
جو پھیر گئے قوم کے چہرے پہ سیاہی
ہم قرض تو لوٹاتے ہیں پر قرض ہی لے کر
یہ حال ہے تو ٹل نہیں سکتی ہے تباہی

اوپر خواجہ محمد زکریا کی چند غزلوں کے جو اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ پاکستانی معاشرے کی صورت حال اور اس کے بارے میں تخلیقی ردعمل کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ انسانی صورت حال کے بارے میں

اپنی بے چینی کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ معاشرتی حالات اور ان کے انسانی کردار پر اثرات کو بیان کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس صداقت سے بھی واقف ہیں کہ بہت کچھ انسانی فطرت میں ایسا ہے جو اسے ایک سفاک مخلوق بنا دیتا ہے۔ ان کی ایک مختصر نظم اس جانب خوبصورت اشارہ کرتی ہے۔

فطرت کب بدلتی ہے
لہو یہاں آ کر رہتا
زمیں کو جس جگہ بھی کھودتے
زیرِ زمیں پانی نہ ہوتا
لہو کہ جھیلیں، کھائیاں، تالاب اور نالے نظر آتے
لہو میں غرق اور ساکت
ازل سے آج تک تاریخ آدم خون میں ڈوبی ہوئی ہے
اور یہ سب کچھ ہوا انسانیت کے نام پر
یہ حقیقت ہے کہ انساں اپنی سفاکی میں
جنگل کے درندوں سے کہیں بڑھ کر ہے ظالم
حال ماضی سے نہیں بہتر ہمارا
اور مستقبل بھی دونوں کا تسلسل ہی تو ہے
خوں فشانی کہانی تو نہیں انسان کی فطرت میں داخل ہے ازل سے
اور فطرت کب بدلتی ہے (۶۰)

اس نظم سے ہمیں بہت واضح اشارہ ملتا ہے کہ شاعر انسانی فطرت کے بارے میں کسی رومانوی تصور کا اسیر نہیں ہے۔ وہ حقیقت پسندی سے انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہے اور انسان کی فطرت میں تباہی اور تشدد کے عناصر کی دائمی موجودگی کا اعتراف کرتا ہے۔ افتاد میں اگرچہ سب سے گہرا رنگ تو حالاتِ حاضرہ پر کی گئی شاعری کا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں محبت کے کومل جذبے ہیں اور ایک حد تک ادھیڑ عمر میں محبت کے جذبے کی بازآفرینی کی جانب واضح اشارے بھی ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی مسائل نے بھی ان کی توجہ کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ انسانی زندگی میں بے مقصدیت انھیں بے چین کرتی ہے اور وہ انسان کی بے بسی اور اس کے وجود میں شامل شر کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس کے باوجود ان کا اعلیٰ انسانی اقدار اور مثالی زندگی کے خواب پر مضبوط ایمان ہے۔ خواجہ محمد زکریا، جدید علوم، فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ بھی کرتے رہتے ہیں جن سے ان کے افکار کو جلا ملتی ہے۔ اس سب کے باوجود خالق کائنات کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہیں اور انسانی زندگی میں خیر مسلسل کے جاری ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ "اقبال" کے دیباچے میں انھوں نے خود اس حوالے سے بات کر رکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

"اگرچہ اس مجموعے میں حالات حاضرہ کی عکاسی گہرے رنگوں میں کی گئی ہے۔ لیکن یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ موضوعات یہی کچھ ہیں۔ میں کبھی جوان بھی تھا اس لیے کہیں کہیں جوانی یاد آ گئی ہے اور بقول سعدی" در عنفوان جوانی چنانکہ افتد و دانی" فلسفیانہ اور مابعد الطبیعاتی مسائل نے ہمیشہ مجھ پر حملہ کیا ہے۔ خصوصاً زندگی کی بے مقصدیت کا مجھے شدید احساس ہے۔ جبر و قدر کے مسائل بھی پریشان کرتے رہتے ہیں۔ جنھیں نہ فلسفہ سلجھا سکا ہے اور نہ سائنس بلکہ Stephen Hawking کی سائنسی جبریت نے مجھے پہلے سے زیادہ الجھا دیا ہے۔ اس کے باوجود میں اعلیٰ اقدار اور اخلاقیات کا قائل ہوں۔ (۲۱)

انسانی زندگی کی معنویت اور آغاز و انجام کے بارے میں غور کرتے ہوئے وہ ایک نظم "گھپ اندھیرا" تخلیق کرتے ہیں۔ خود اس نظم کا عنوان ہمیں بتاتا ہے کہ شاعر انسان کے حوالے سے کسی خوش فہمی کا شکار نہیں اور وہ اپنے چاروں طرف پھیلی کائنات میں ایک مہیب اندھیرا دیکھتا ہے، جس نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔ نظم دیکھیں۔

گھپ اندھیرا

کس نے یہ دنیا بنائی
اور آخر کیوں بنائی
سوچتے ہی گھور اندھیرا اچھل جاتا ہے مرے چاروں طرف
کیا وہ تنہائی سے تنگ آیا ہوا تھا
آدم و حوا ہی کیا کافی نہ تھے اس کے لیے
ان مخلوقوں کو بنایا تھا تو پھر تخلیق کی لذت انھیں دینا ضروری تھا؟
کاش ایسا کچھ نہ ہوتا

نسلِ آدم کی یہ ساری خوں فشاں تاریخ بھی معدوم ہوتی
اور اب یہ سلسلہ روزِ ازل سے تا ابد جاری رہے گا
اور ابد کے بعد کیا ہوگا کسی کو کیا پتہ
کیا میں پھر یوں سال سویا ہی رہوں گا
یا اٹھایا جاؤں گا اس جسمِ فانی میں جو لافانی بنایا جائے گا
اور پھر ان صد زماں میں وقت کاٹوں گا میں لاکھوں
دل نشیں شغلوں کے ساتھ
کیسے ممکن ہے کہ میں اکتا نہ جاؤں اس طرح کی زندگی سے
جس میں یکسانی ہی یکسانی ہو
اور اس سے نکلنے کا کوئی رستہ نہ ہو
گھور اندھیرا ہے مرے چاروں طرف
کیا وہی سچے ہیں جو اس زندگی کے عیش کو سب کچھ سمجھتے ہیں
مگر ہم سے یہ کہتے ہیں
حیاتِ دائمی کے ان تحائف کو بساؤ دل میں
جو اس زندگی کے بعد تم کو ملنے والے ہیں (۶۲)

اس طرح کے خیالات آپ کو ان کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں۔ یہاں زیادہ مثالوں کی گنجائش نہیں صرف ایک غزل کے دو اشعار درج کیے جاتے ہیں!

ہمیں یہ وہم ہے سب قصے ان سے پیدا کیے ہوئے
وہ آسماں کہ جن کا کہیں وجود نہیں
فلک کو ہم نے دیا اپنی اپنی سوچ کا رنگ
یہ زرد، سرخ، سیہ، سبز یا کبود نہیں (۶۳)

''اثاثہ'' میں شامل بعض غزلیں بتاتی ہیں نوجوانی کی رومانی محبت خواجہ محمد زکریا کے وجود میں اب بھی زندہ ہے۔ محبت کا تجربہ انہیں بار بار اپنی جانب کھینچتا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ ماضی کی محبت کی بازآفرینی ہے اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو تازہ محبت ہے اور کہیں کہیں تو حال اور ماضی باہم گلے ملتے

دکھائی دیتے ہیں۔ ذیل میں غیر ردیف غزل کے چند شعر، جس میں انھوں نے قوافی کو مشاق سے استعمال کر کے عجیب رنگ پیدا کیا ہے۔

قریب آ کے بھی آتے نہیں وہ میرے قریب
ہمارا ربط ہے مدت سے پر عجیب و غریب
سمجھ میں آتا نہیں کیوں قریب آتے ہیں
قریب آتے ہیں پھر کیوں انھیں ہے جاتا نہیب
ملے کبھی جو کوئی خوش مزاج و خوش اطوار
پکار اٹھتا ہوں خود ہی کہ واہ! میرے نصیب
کرم جب اس کا ہو بارانِ تیز کی صورت
تو یہ سمجھتا ہوں کوئی نہیں ہے میرا رقیب (۹۴)

اسی طرح کی ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ کریں۔

میں گزرتا تھا ادھر سے وہ لبِ بام آ گیا
اک جھلک دیکھی تھی اور چاہت کا الزام آ گیا
سوچتا ہوں میں بظاہر وجہ تو کوئی نہ تھی
دفعتاً کل میرے ہونٹوں پر کوئی نام آ گیا
یہ تعلق نبھ نہیں سکتا، مجھے معلوم تھا
پر توقع سے بھی پہلے اس کا انجام آ گیا
وقت تھوڑا اس کی ہمراہی میں کاٹا تھا ابھی
صبح کا بھولا ہوا واپس سرِ شام آ گیا (۹۵)

خواجہ صاحب کے دوسرے شعری مجموعے "اقتدا" کے حوالے سے بھی یہ بات بھی اہم ہے کہ اس مجموعے میں تحریری مکاسی (Illustrations) بھی شامل ہے۔ کل آٹھ Illustrations کتاب میں شامل کی گئی ہیں جنھیں ہمارے مشہور مصور اور ناول نگار دوست ریاظ احمد نے بنایا ہے۔ اس سے نہ صرف کتاب زیادہ دیدہ زیب ہو گئی ہے بلکہ یہ Illustrations کتاب کے معنی اور مفہوم کو بھی زیادہ واضح کرتے ہیں۔

اس باب میں ہم نے مختصر انداز میں خواجہ محمد زکریا کے دو شعری مجموعوں کے حوالے سے ان کے موضوعات، زبان و بیان اور طرزِ ادا کے بارے میں بات کی ہے۔ ان مجموعوں کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں شعر گوئی کا بڑا ملکہ موجود تھا۔ لیکن اپنی تدریسی مصروفیات اور تحقیق و تنقید کے کام میں ان کے انہماک نے اسے پورے طرح اظہار نہیں پانے دیا۔ اگر وہ اس میں اور پوری توجہ دیتے تو بقول احسان دانش ان کا شمار اپنے عہد کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا۔ موجودہ حالت میں بھی ان کی شاعری اچھے اچھے شاعروں سے پہلو مارتی ہے اور یہ کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔

حواشی

۱۔ خواجہ محمد زکریا، ''آشوب'' الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء (ص: ۱۱)
۲۔ ایضاً (ص: ۱۵)
۳۔ عشرت سلطانہ، خواجہ محمد زکریا: حیات و فن (ایم فل مقالہ) مشمولہ ''خواجہ محمد زکریا کی شاعری: تنقیدی نظر'' مرتبہ ڈاکٹر شگفتہ زکریا، سنگت پبلشرز، لاہور
۴۔ خواجہ محمد زکریا، آشوب، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء (ص: ۱۸۔۱۹)
۵۔ ایضاً (ص: ۱۹)
۶۔ ایضاً (ص: ۸۰)
۷۔ ایضاً (ص: ۸۷)
۸۔ ایضاً: ''پس سرورق''
۹۔ ایضاً (ص: ۸۹۔۹۰)
۱۰۔ ایضاً (ص: ۹۵)
۱۱۔ ایضاً (ص: ۹۶)
۱۲۔ ایضاً (ص: ۱۰۰)
۱۳۔ ایضاً (ص: ۱۰۲)
۱۴۔ ایضاً (ص: ۱۱)
۱۵۔ ایضاً (ص: ۹۳)
۱۶۔ ایضاً (ص: ۹۰)
۱۷۔ ایضاً (ص: ۹۸)
۱۸۔ ایضاً (ص: ۹۳)
۱۹۔ ایضاً (ص: ۸۰)
۲۰۔ ایضاً (ص: ۹۹)
۲۱۔ اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر ''آشوب'' پر چند طرح مشمولہ ''خواجہ محمد زکریا کی شاعری: تنقیدی نظر'' مرتبہ ڈاکٹر شگفتہ زکریا، سنگت پبلشرز، لاہور، ص: ۴۹۔۵۰
۲۲۔ خواجہ محمد زکریا، آشوب، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص: ۱۰۷
۲۳۔ ایضاً (ص: ۱۰۸)
۲۴۔ ایضاً (ص: ۱۱۷)
۲۵۔ ایضاً (ص: ۱۱۸)

باب پنجم

دیگر اصناف ادب

گزشتہ ابواب میں ہم نے خواجہ محمد زکریا کی سوانح ان کی شخصیت سے بات شروع کر کے ان کے اہم علمی اور ادبی کارناموں کا احاطہ تحقیق، تنقید اور شاعری کے عنوانات سے کیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے ایک طویل اور متنوع علمی اور ادبی زندگی بسر کی ہے۔ کچھ چیزیں اول تا آخر ان کی دلچسپی کا مرکز رہی ہیں اور بعض چیزوں کی طرف وہ گاہے گاہے متوجہ ہوتے رہے ہیں۔ اس باب میں ہم ان کی ایسی علمی و ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کریں گے جن کی طرف وہ کم کم متوجہ ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود بہ اعتبار معیار اور مقدار ان کے یہ کام بھی قابل قدر ہیں اور ان کی علمی شخصیت اور ادبی قد و قامت کو سمجھنے کے لیے ان کا تذکرہ ضروری ہے۔ اس باب کو ہم مندرجہ ذیل چار ذیلی عنوانات میں زیر بحث لائیں گے۔

1- خواجہ محمد زکریا کی خاکہ نگاری / شخصیت نگاری
2- خواجہ محمد زکریا کی تاثراتی تحریریں
3- خواجہ محمد زکریا کے انتخابات
4- خواجہ محمد زکریا کے انٹرویوز

خواجہ محمد زکریا کی خاکہ نگاری / شخصیت نگاری

خاکہ نگاری کسی بھی فرد کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے چند جملوں یا لکیروں کی مدد سے شخصی خاکہ بنانا ہے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری کی روایت سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش تو ہمیں خطوط غالب میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق، فرحت اللہ بیگ، شاہد احمد دہلوی، سعادت حسن منٹو، رحیم گل، ممتاز مفتی، اعجاز رضوی اور دیگر تخلیق کاروں نے عمدہ خاکے تحریر کیے ہیں۔ خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے اس میں اختصار، چست جملے، بذلہ سنجی اور دیگر حربوں سے فرد کی

شخصیت کا نقشہ کھینچا جاتا ہے۔

خواجہ محمد زکریا کی خاکہ نگاری کا آغاز 1970ء کے بعد ہوا اور ان کی پہلی کتاب جس میں خاکے شامل کیے گئے "چند اہم جدید شاعر" ہے۔ اس کتاب میں شامل تین تحریریں شخصی خاکوں کی ذیل میں آتی ہیں یہ جعفر طاہر، علاءالدین کلیم اور مجید امجد کے بارے میں ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں ان اصحاب سے خواجہ صاحب کے ذاتی تعلقات اور ملاقاتیں رہی ہیں۔ اس لیے ان کے خاکوں میں یادنگاری کا عنصر نمایاں ہے۔ وہ جس فرد کا خاکہ لکھتے ہیں اس کے شخصی اوصاف نمایاں کرتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر بات کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے ان کا رویہ ہمدردانہ ہوتا ہے وہ کسی کی تضحیک نہیں کرتے نہ ٹھٹھا اڑاتے ہیں۔ فرد کی علمی و ادبی خدمات کا حوالہ بھی دیتے جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جس فرد کا خاکہ وہ لکھ رہے ہیں اس کے شخصی خدوخال کے ساتھ ساتھ اس کے ادبی کام سے بھی قاری واقف ہو جائے اس حوالے سے ان کا پہلا خاکہ جعفر طاہر کا ہے وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جعفر طاہر کی شخصیت ایسی تھی کہ ان کے کلام کی عظمت سے ناواقف شخص ان کے پاس بیٹھ کر الجھن محسوس کرتا تھا۔ انانیت اور مردم بیزاری تو اکثر ادبا میں ہوتی ہے۔ اس لیے اس بات کو برداشت کیا جا سکتا ہے مگر جعفر طاہر مشتعل ہو جاتے تھے تحقیر کرتے تھے اور غصے میں آ کر ننگی گالیاں دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ بڑے ہی وسیع المطالعہ شخص تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے حافظہ بھی غضب کا پایا تھا۔ انھیں ایک وسیع ذخیرہ الفاظ پر تصرف حاصل تھا اور حسب ضرورت وہ خود بھی الفاظ تراش لیتے تھے۔ ذخیرہ الفاظ کی وسعت کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ کے مزاج شناس بھی تھے۔ (۱)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ خواجہ محمد زکریا نے جعفر طاہر کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں پر بات کی ہے۔ جعفر طاہر سے شخصی تعلق کے باوجود ان کے بارے میں جس قدر ممکن ہے معروضیت کو اپنایا ہے۔ جعفر طاہر کے بارے میں اپنی یادیں اور تاثرات کو بلا کم و کاست بیان کیا ہے اور یوں جعفر طاہر کی ایک حقیقی تصویر کھینچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

خواجہ محمد زکریا کی تخلیق دوسرا خاکہ "علاءالدین کلیم...... روشنی کی جستجو" ہے۔ علاءالدین کلیم انگریزی ادب کے استاد تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں خواجہ محمد زکریا کو ان سے پہلی ملاقات کا موقع ملا۔ خواجہ محمد زکریا کی زیر نظر تصنیف سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ علاءالدین کلیم ایک مردم بیزار، انتہائی خشک مزاج،

دوسروں سے فاصلہ پر رہ کر تعلق بنانے والے فرد تھے۔ شراب نوشی کے باعث جواں مرگی کا شکار ہوئے۔ وسیع مطالعہ تھے لیکن خود کو بہت زیادہ پڑھا لکھا ظاہر کرنے کا شوق تھا۔ محفلوں میں خاموش رہتے تھے۔ غزل بہت عمدہ لکھتے تھے اوران کی غزل روایتی سانچے میں جدت طرازی کی عمدہ مثال ہے۔ خواجہ صاحب نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں علاالدین کلیم کی شخصیت کے بنیادی خدوخال کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے اوران کا عمدہ خاکہ کھینچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا کی علمی و تحقیقی زندگی کا سب سے بڑا حوالہ مجید امجد ہے۔ انھوں نے نہ صرف مجید امجد کا کلیات نہایت سلیقے سے مرتب کیا ہے بلکہ وہ ان کے بارے میں مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ انھی تحریروں میں ایک مجید امجد کا خاکہ "مجید امجد کے بارے میں" ہے جو خواجہ صاحب کے مجید امجد کے بارے میں تاثرات اور یادوں پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے مجید امجد کے بعض شخصی اوصاف کو بھی نمایاں کیا ہے۔ جس سے ہم جیسے وہ لوگ جنھیں مجید امجد کو دیکھنے پانے کا اتفاق نہیں ہوا ان کے ذہن میں بھی مجید امجد کی ایک ہلکی سی تصویر بن جاتی ہے۔ جن لوگوں نے مجید امجد کی ذاتی زندگی کے بارے میں لکھا اکثر یا سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ایک تنہا شخص تھے اور اپنی ذات میں گم خودداری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ خواجہ صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

"امجد صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد تین مرتبہ ان سے ملنے گیا ہوں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اب تنہا رہ گئے ہیں۔ ہوش پر جادہ کم ہو چکا ہے۔ گھر پر بھی شاید ہی لوگ ان سے ملنے آتے ہوں۔ میں کئی کئی گھنٹے ان کے ہاں بیٹھا رہا ہوں۔ اسے اتفاق کہیے یا معمول..... ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی ملنے والا آ نکلا ہو۔ مجھے ان کی تنہائی سے وحشت سی ہوتی تھی۔ ایک چھوٹا سا مکان جس میں نہ بیوی نہ بچے۔ ایک وہ خود اوران کا خدمت گار علی محمد، ایک چارپائی، ایک پرانی میز، دو تین خستہ شکستہ کرسیاں، ایک پرانا ریڈیو..... جس کی سوئی ادھر ادھر گھماتے رہتے۔ چند کتابیں اور رسائل..... یہ تھی وہاں کی کل کائنات۔ میں نے ایک بار پوچھا آپ کو بہت کم پنشن ملتی ہوگی، کیا گزر اوقات میں دقت نہیں ہوتی؟ کہنے لگے: میری ضروریات بہت کم ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ابھی پنشن ملنی بھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ آخر وہ بیمار رہنے لگے تھے ان کے پاس کوئی کام کا کپڑا نہیں رہا تھا۔ شدید سردی میں ایک بوسیدہ ٹھنڈی پتلون ان کا لباس تھا۔ مگر وہ اتنے خوددار تھے کہ انھیں کچھ کہنا ان کی ناراضگی کو دعوت دینا تھا۔" (۴)

اوپر جو چند جملوں کا اقتباس مجید امجد کے بارے میں نقل کیا گیا ہے اس سے مجید امجد کی شخصیت

اور ان کی آخری دنوں کی زندگی کا ایک نقشہ بن جاتا ہے اور یہی خاکہ نگاری کا فن ہے کہ کم سے کم الفاظ اور تفصیلات کی مدد سے ممدوح کے بارے میں قاری کے ذہن میں ایک نقش بنا دیا جائے۔

خواجہ محمد زکریا نے ان کے بعد بھی خاکہ نگاری کے کام کو جاری رکھا اور ان کی ان تحریروں کو بعد میں ڈاکٹر آصف علی چٹھہ نے "تاثراتی اور تنقیدی تحریریں" کے نام سے مرتب کیا۔ اس میں مرتب نے خواجہ محمد زکریا کے مضامین کو تین ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ "شخصیت اور فن" کے زیر عنوان 17 تحریریں ہیں جن میں سے دس تحریریں بلاشبہ خاکہ نگاری کی ذیل میں آتی ہیں۔ ان میں جعفر طاہر اور علاء الدین کلیم کے بارے میں تحریریں بھی شامل ہیں جن پر ہم اوپر گفتگو کر آئے ہیں۔ یوں خواجہ محمد زکریا کے مطبوعہ اور مرتبہ خاکوں کی تعداد گیارہ بنتی ہے۔ جن اصحاب کے خاکے لکھے گئے ہیں ان میں پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مشفق خواجہ، اشفاق احمد، مرزا محمد منور، حنیف ثاقب اور صدیق جاوید شامل ہیں۔

مندرجہ بالا ناموں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ خواجہ محمد زکریا کا حلقہ احباب کتنا وسیع اور متنوع ہے۔ کیسے کیسے مختلف المزاج لوگ ان کے قریبی دوستوں اور بزرگوں میں شامل رہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر خواجہ محمد زکریا کے بارے میں کہا جا چکا ہے کہ وہ اپنے موضوع پر نہایت صفائی اور سلیقے سے لکھتے ہیں۔ ان کا ذہن بہت صاف و شفاف ہے اس لیے ان کی تحریر میں وہ بات واضح انداز میں ملتی ہے۔ "تاثراتی اور تنقیدی تحریریں" کے مرتب ڈاکٹر آصف علی چٹھہ نے ان کی تحریروں کی اس خوبی کی جانب بہت اچھی طرح اشارہ کیا ہے۔

"وہ کسی بھی مصنف یا ادب پارے کے بارے میں مبہم اور غیر یقینی رائے کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان کے بے لاگ تبصرے تشکیک کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔ آپ کو ان کے ہاں رومانی انداز کی جملہ سازی نظر نہیں آئے گی۔ سچ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی طرح ان کی تحریریں بھی واضح شفاف اور ابہام سے پاک ہیں۔" (۳)

خیال اور تحریر کا واضح ہونا جتنا تنقیدی تحریر کے لیے ضروری ہے۔ اتنا ہی خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری کے لیے بھی اہم ہے۔ اوپر ہم نے تین خاکوں پر بات کی ہے زیر نظر کتاب میں شامل دیگر خاکوں کے مطالعے سے بھی ہمیں خواجہ محمد زکریا کی اس لسانی اور ادبی خوبی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً پروفیسر حمید احمد خاں کے خاکے میں ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر حمید احمد خاں کے اختلافات کی بات کو انھوں نے نہایت

اختصار اور سلیقے سے بیان کیا ہے۔ بات بڑے واضح انداز میں کہی ہے اور کس فرد کا کیا کردار تھا؟ اس کی جانب بھی واضح اشارے کر رہے ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے خاکے کا عنوان انھوں نے "کثیرالجہت شخصیت" رکھا ہے اور خاکے میں جس طرح انھوں نے حمید احمد خاں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عنوان ممدوح کی شخصیت کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔

"ڈاکٹر وحید قریشی ... ایک دیو قامت انسان" میں انھوں نے بتایا ہے کہ وحید قریشی ظاہری اور باطنی ہر دو اعتبار سے ایک دیو قامت انسان تھے۔ آغاز وحید قریشی کی پہلی کلاس سے ہوتا ہے اور ڈاکٹر وحید قریشی کی وفات تک کے دنوں پر محیط یہ خاکہ ممدوح کی ذاتی زندگی سے زیادہ اس کی علمی زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور جس میں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تحقیقی و علمی کام کتنا اعلیٰ اور متنوع نوعیت کا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وحید قریشی کی شاعری اور ان کی مدیرانہ زندگی پر بھی بات کی ہے۔ "خاکہ" کے آخر پر اندازہ ہوتا ہے کہ وحید قریشی واقعی ہی ایک دیو قامت انسان تھے۔

"ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار" کے بارے میں لکھے گئے خاکہ کا عنوان "کھرا انسان" ہے اور جو لوگ شخصی حوالے سے غلام حسین ذوالفقار سے واقف ہیں وہ خواجہ صاحب کے عنوان کو ضرور پسند کریں گے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کا خاکہ زیادہ تر ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہے۔ وہ اپنے تمام تر تعلقات کے باوجود ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب بے حد دیانت دار شخص تھے۔ سرکاری روپے پیسے خرچ کرنے میں انتہائی محتاط بلکہ جزرس۔ سرکاری فون بھی کم کم استعمال کرتے تھے۔ سرکاری بجٹ سے "تواضع" کرنے کی بجائے اپنی جیب کو ہلکا کرنا پسند کرتے تھے لیکن اُن کا سٹاف کے ساتھ دو طرح کا رویہ ہوتا۔ مکمل اعتماد یا مکمل شک کا۔ انتظامی معاملات میں یہ دونوں رویے دیر تک ساتھ نہیں دیتے۔ چنانچہ اس کی مثالیں موجود ہیں کہ بعض کلرکوں نے مکمل اعتماد سے ناجائز فائدے اٹھائے اور بعض نے ان کے خلاف زبان درازی کی تاہم وہ ڈرنے یا جھکنے والے نہیں تھے۔" (۳)

"ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ... کھرا انسان" کے آخر میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے 46 علمی و ادبی کاموں کی تفصیلی فہرست درج کر کے ان کی علمی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس خاکے میں ڈاکٹر ذوالفقار کی اسلام پسندی اور ذہنی فکری رواداری کی جانب بھی واضح

اشارے کیے ہیں۔

''ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی..... شخصیت اور فن'' خاکہ اور تاثراتی تنقید کا ملاپ ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے پہلے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے شخصی پہلوؤں پر بات کی ہے اور پھر انھوں نے صدیقی صاحب کے کام کا تذکرہ کیا ہے۔ انداز بالکل وہی ہے جو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے خاکے میں اپنایا گیا تھا۔ خواجہ محمد زکریا کیوں کہ خود علمی مزاج رکھتے ہیں اس لیے وہ خاکہ لکھتے ہوئے بھی اپنے ممدوح کے علمی کاموں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرز کو اپنانے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب تک آپ علمی اور ادبی شخصیت کے کاموں کا تذکرہ نہ کریں تو اس وقت تک اس کی شخصیت کا احاطہ ممکن نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ علمی کاموں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کا انداز خاکہ نگار سے زیادہ مضمون نگار کا ہو جاتا ہے۔

''مشفق خواجہ'' پر اپنی تحریر کو انھوں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے پہلے حصے کا عنوان (ا) ''خوش طبع انسان'' ہے جس میں شخصی اوصاف پر بات کی ہے اور دوسرے حصے (ب) ''بے مثال محقق'' میں مشفق خواجہ کے تحقیقی کام کا تذکرہ ہے۔ یہ انداز زیادہ بہتر ہے کہ خاکہ اپنی جگہ مکمل ہو جاتا ہے اور علمی و تحقیقی کام کا تذکرہ الگ سے ہو جاتا ہے۔ مشفق خواجہ کی بذلہ سنجی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ خواجہ محمد زکریا اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب سے میری زیادہ ملاقاتیں لاہور میں ہوئیں۔ کسی زمانے میں وہ سال میں ایک دو بار لاہور آ جاتے تھے۔ کبھی اورینٹل کالج، کبھی فلیٹیز ہوٹل میں اور کبھی کسی اور جگہ ان سے ملاقاتیں ہو جاتی تھیں، بعض مختصر اور اکثر طویل۔ ان کی طبیعت میں بڑی شگفتگی تھی اور بات بات میں نادر نکتے پیدا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہم آئیڈیل بک ہاؤس انارکلی میں بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب بھی تھے۔ میں نے اجازت چاہی اور کہا کہ ایک گھنٹے تک دوبارہ آ جاؤں گا۔ ان دنوں میرے بچے چھوٹے تھے میں انھیں سکول سے گھر چھوڑتا تھا۔ مجھے واپسی پر دیر ہو گئی اور جب انارکلی پہنچا تو خواجہ صاحب سمیت سب لوگ جا چکے تھے۔ کراچی جا کر انھوں نے ڈاکٹر صاحب (وحید قریشی) کو خط لکھا جس میں یہ جملہ بھی تھا کہ خواجہ زکریا سے کہیں کہ مشفق کراچی چلا گیا ہے اس لیے اب بے شک آئیڈیل بک ہاؤس چلے جائیں۔'' (۵)

''مرزا محمد منور..... محبت اور نفرت کا انسان'' نامور ماہر اقبالیات مرزا محمد منور اور خواجہ محمد زکریا کے باہمی تعلقات کی دلچسپ روداد ہے۔ اس خاکے میں خواجہ صاحب نے مرزا منور کی فکر، ان کے ذہنی

رجحانات اور ان کی خوبیوں اور خامیوں پر صاف گوئی سے بات کی ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے اپنے اس خاکے میں مرزا منور کی شخصی خوبیوں، علمی قابلیت، مختلف زبانوں پر ان کی دسترس کو نہایت فراخ دلی سے بیان کیا ہے اور اس بات کا اعتراف کرنے میں کسی جھجک سے کام نہیں لیا کہ مرزا منور نے ان کے تلفظ کی اصلاح کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ مرزا منور کی قابلیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"فارسی، عربی اور اُردو کے ساتھ ساتھ ان کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔ جن دنوں انھیں عرق النسا کی تکلیف ہوئی تو انھوں نے بیماری کی حالت میں لیٹے لیٹے ایم۔ اے فلاسفی کی تیاری کی اور آسانی امتحان پاس کر لیا اس کے باوجود مجھے یہ گمان تھا کہ وہ انگریزی لکھنے پڑھنے میں تو بہت اچھے ہیں لیکن آخر سرگودھا کے رہنے والے ہیں اور اُردو میڈیم میں پڑھے ہیں۔ اس لیے انگریزی بول چال میں یقیناً کمزور ہوں گے لیکن یہ غلط فہمی بھی جلد رفع ہو گئی۔ ایک دن میں گورنمنٹ کالج میں ان سے ملنے گیا تو پتہ چلا کہ فضل حسین تھیٹر میں ایم۔ اے فلاسفی کے طلبہ کو لیکچر دے رہے ہیں۔ میں وہاں جا کر آخری نشست پر جا بیٹھا۔ جب میری سماعت سے ان کا پہلا جملہ ٹکرایا تو وہ انگریزی میں تھا۔ میں سمجھا کوئی اقتباس سنا رہے ہیں، لیکن چند منٹ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ انگریزی میں لیکچر دے رہے ہیں۔ ان کے لہجے میں سرگودھے کا انداز موجود تھا۔ لیکن انگریزی اچھی اور تقریر رواں تھی۔ اسی طرح اقبال کانگرس میں جب وہ ایران گئے تو انھوں نے فارسی میں خطاب کیا۔ لہجہ غیر ایرانی تھا لیکن فارسی کی عبارت قابل داد تھی۔ اسی طرح عربی بول چال میں بھی ان کی روانی قابل ستائش تھی۔"(۲)

جو شخص بھی خواجہ محمد زکریا کا مرزا منور کا زیر نظر خاکہ پڑھے گا وہ مرزا منور کی قابلیت کا قائل ہو جائے گا۔ ان کی زبان دانی، ادب فہمی اور اقبالیات میں ان کی مہارت کو تسلیم کرے گا اور میرے خیال میں یہ ایک کامیاب خاکے کی علامت ہے۔

حفیظ تائب ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی کا اہم نام ہے۔ خاص طور پر ان کی نعت گوئی اور پنجابی ادب کے لیے خدمات کا ہر کوئی معترف ہے۔ خواجہ محمد زکریا سے اور نیٹل کالج کے حوالے سے حفیظ تائب کے بڑے گہرے اور دیرینہ مراسم رہے ہیں۔ ان کی لکھی تین تحریریں زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔ حفیظ تائب(۱) "صاحب فن مرد شریف" خاکہ ہے جبکہ باقی دو تحریریں تاثراتی تنقید کی ذیل میں آتی ہیں جن کا تذکرہ آگے چل کر آئے گا۔ حفیظ تائب ایک صلح کل شخص تھے جو اپنے نرم لب و لہجے سے سامعین کے دل موہ لیتے تھے۔ وہ اپنے طلباء میں بھی ہر دل عزیز تھے اور اساتذہ بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ خواجہ محمد

زکریا اپنے خاکے میں ان کی ان خوبیوں کا ذکر درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

"اورینٹل کالج کے مختلف الخیال اساتذہ حفیظ تائب کے مداح تھے اور ان سے قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ ان کے سب اساتذہ سے یکساں تعلقات تھے۔ غیبت، بدگوئی اور تکبر جیسی مذموم عادات سے کلیتاً پرہیز کرتے تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے۔ شائستہ انداز میں اختلاف کرتے تھے اور اختلافات کو ذاتی دشمنی میں نہیں بدلتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سبھی لوگ اتنے نیک تھے کہ انھوں نے ان کے بارے میں کبھی تحفظات کا اظہار ہی نہیں کیا۔ ایک ایسا شخص جو طلبہ کا آئیڈیل ہو، بیشتر اساتذہ سے خوشگوار تعلقات رکھتا ہو اور انتظامیہ کے دل میں جس کا احترام ہو کیسے ممکن ہے کہ اس کے بارے میں رشک وحسد کے جذبات پیدا نہ ہوں۔"(۷)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ خواجہ محمد زکریا نے کس خوبی اور اختصار سے حفیظ تائب کی شخصی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں بعض احباب کے دلی جذبات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ خاکہ نگاری کا فن اختصار اور اشارے کنایے کا فن ہے۔ یہ چند لفظوں اور جملوں میں قاری تک پوری بات کو منتقل کرنے کا فن ہے اور خواجہ محمد زکریا کے خاکوں میں یہ خوبی ہمیں بہت نمایاں انداز میں ملتی ہے۔ اس کتاب میں شامل آخری خاکہ "صدیق جاوید...... یہ دلوں میں جو دیار زندہ" ہے۔

صدیق جاوید سے خواجہ محمد زکریا کے دوستانہ تعلقات سب سے زیادہ گہرے اور دیرپا رہے ہیں۔ صدیق جاوید سے ان کا ذاتی تعلق قیام جھنگ کی یادگار تھا۔ پھر اورینٹل کالج میں جب صدیق جاوید ایم۔ اے اردو کے فائنل میں تھے تو خواجہ محمد زکریا استاد بن کر آئے اور ان دونوں کا تعلق نہایت قریبی دوستی میں ڈھل گیا۔ خواجہ محمد زکریا نے اپنے خاکے میں صدیق جاوید کی شخصی خوبیوں اور ان کے علمی کام دونوں کی جانب بڑے خوبصورت اشارے کیے ہیں۔ صدیق جاوید کی شخصی خوبیوں کی جانب یوں اشارہ کرتے ہیں۔

"صدیق جاوید میں بہت سی ذاتی خوبیاں تھیں۔ وہ وضع دار اور متواضع شخص تھا۔ کوئی کام اس کے سپرد کیا جائے تو اسے یاد رکھتا تھا اور اسے انجام دینے میں خلوص سے کوشش کرتا تھا۔ کئی لوگوں کی ترقی درجات کے لیے اس نے بہت تگ و دو کی۔ کئی طلبا اور طالبات تحقیقی مقالات کی تکمیل کے لیے اس سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ کسی کے کتنا بھی خلاف ہوتا مگر روبرو کبھی شائستگی کو ترک نہ کرتا۔ میں نے اسے بڑا مہمان نواز پایا۔ اپنی بساط سے بڑھ کر مہمان نوازی کرتا اور کتابیں خریدنے کے لیے اپنی دیگر ضروریات کو بھی پس پشت ڈال دیتا۔"(۸)

آگے چل کر صدیق جاوید کے شخصی اوصاف کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں۔

''آخر میں یہ کہوں گا کہ مجموعی طور پر وہ میرے ہم عصر دوستوں میں بہت صاحب مطالعہ، دوست دار اور کھرا شخص تھا۔ اس کی شخصیت میں تضادات نہیں تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر آتا، جس سے محبت ہوتی، اس کی خامیوں کو نظر انداز کر دیتا مگر جب کسی وجہ سے کوئی شخص ناقابل برداشت ہو جاتا تو پھر کڑھتا رہتا اور دل کا غبار تلخ انداز میں بھی نکالنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔''(۹)

صدیق جاوید کا خاکہ خواجہ محمد زکریا کے دل کی آواز ہے اور اس میں جذباتی لے قاری کو متاثر کرتی ہے۔ خواجہ محمد زکریا کا یہ خاکہ اور ان کے تحریر کردہ دوسرے خاکے اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ ان میں فن خاکہ نگاری کا فہم ہے اور وہ اچھے خاکے لکھنے پر قادر ہیں۔

خواجہ محمد زکریا نے بعض مضامین ایسے بھی تحریر کیے ہیں جنھیں شاید تنقیدی مضامین کہنا تو مشکل ہے مگر اس میں شخصیت نگاری، تاثراتی تنقید اور شاعرانہ کلام کا فنی اور تنقیدی جائزہ شامل ہے۔ ان میں تین مضامین تو الطاف حسین حالی کی زندگی اور فن پر لکھے گئے ہیں۔ حالی کا شمار جدید ادب کی شاعری اور تنقید کا آغاز کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ اور خواجہ محمد زکریا ان کی شاعری اور تنقید دونوں کے قائل ہیں۔ حالی کے سلسلے کا پہلا مضمون ''حالی چاروں دیاں'' ہے جو زیر مطالعہ کتاب ہی کا حصہ ہے۔ اس مضمون میں بات کا آغاز حالی کی زندگی اور شخصیت سے ہوتا ہے اس کی غزل پر تفصیلی بات ہے۔ حالی کی غزل کو عموماً قدیم اور جدید ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب الطاف حسین حالی کے بارے میں دیگر نقادوں کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی غزل میں جدید دور کی غزل کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور حالی نے غزل کے تنگ دائرے کو وسیع کرنے کا جو کام کیا ہے اسے بلیغ کوشش قرار دیتے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا کے مرتب کردہ ''کلیات حالی'' اور اس کے مقدمے کا تذکرہ تحقیقی باب میں ہو چکا ہے۔ یہاں ہم ان کے ''مقدمہ'' کلیات حالی پر ایک بار نگاہ ڈالتے ہیں۔ اس میں وہ بات کا آغاز تو ''حیات حالی'' کے عنوان سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ حالی کی شعری خدمات کی جانب آتے ہیں۔ یہاں وہ حالی کی غزل، نظم، مسدس حالی قطعات اور رباعیات پر بات کرتے ہیں۔ پھر وہ آخر میں اس نقطے پر روشنی ڈالتے ہیں کہ انھوں نے یہ ''کلیات حالی'' کیوں مرتب کی ہے۔ اس انداز کو انھوں نے کلیات حفیظ جالندھری، کلیات داغ اور نظر نامہ میں بھی برقرار رکھا ہے۔

الطاف حسین حالی کا بہت اہم کام ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن ڈاکٹر وحید

قریشی نے مرتب کیا تھا اور یہ 1952ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر وحید قریشی کی اپنی عمر 26 سال تھی اور خواجہ محمد زکریا ان کے اس کام سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے انھوں نے 2018ء میں اس کی مکرر اشاعت کو ممکن بنایا اور اس پر ایک مقدمہ "مقدمہ در مقدمہ" کے عنوان سے لکھا۔ یہ کام دراصل "Meta Criticism" کی ذیل میں آتا ہے جسے ہم تنقید کی تنقید قرار دے سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے بڑی خوبی سے ڈاکٹر وحید قریشی کے کام کی تعریف بھی کی ہے اور اس میں موجود نقائص کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ:

"کسی ادبی و تنقیدی تحریر پر کچھ لکھنے سے پہلے اس کا مطالعہ تمام تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر کرنا چاہیے بلکہ جج کی طرح شک کا فائدہ مصنف کو دینا چاہیے۔"(۱۰)

میرے خیال میں خواجہ محمد زکریا نے ادب کی تنقید اور پرکھ کے لیے اچھا عملی نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ "مقدمہ شعر و شاعری" پر وحید قریشی کے کام کا احاطہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"چھبیس سالہ وحید قریشی نے مقدمہ شعر و شاعری کی تدوین کو کر کے ایک انتہائی قابل قدر کام کیا تھا خصوصاً مقدمے کے مغربی اور مشرقی ماخذ کا سراغ لگا کر انھوں نے مقدمے کی تفہیم کے لیے ایک نیا میدان فراہم کر دیا تھا لیکن وہ مقدمے کی اہمیت کا درست تعین نہیں کر سکے۔ جوانی کا زمانہ، مزاج جارحانہ، نفسیات سے نئی نئی آگاہی، مغربی تنقید سے عامیانہ واقفیت نے مل کر ان کی تنقید کو یک رخا بنا دیا ہے۔ انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری کے بہت سے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مقدمے میں فن شعر پر جو باریک بحثیں ہیں وہ آج بھی پرانی نہیں ہوئیں مگر وحید قریشی منفی باتوں کو حد سے زیادہ بڑھا کر دکھانے میں اتنے محو رہے کہ ان کی طرف توجہ نہیں کی۔"(۱۱)

خواجہ محمد زکریا چوں کہ حالی کے شعری اور تنقیدی کام کو بہت اہم جانتے ہیں اس لیے وہ بار بار حالی پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس کا آغاز ان کی پہلی کتاب "اردو کی قدیم اصناف شعر" سے ہوتا ہے جس میں شاعری کے انتخاب میں حالی کی رباعیات اور تنقید کی ذیل میں "رباعیات" کے زیر عنوان حالی کی رباعی نگاری پر بات کی گئی ہے۔ اس کے بعد ان کے دوسرے تنقیدی مجموعے "نئے پرانے خیالات" میں بھی ایک مضمون "حالی اور شفیعہ" کے تقابل پر موجود ہے اور انھوں نے اس وقت موجود رائے کو رد کیا ہے کہ حالی کو حالی شفیعہ نے بنایا۔ اور پھر متذکرہ تین مضامین میں ہم دیکھتے ہیں خواجہ محمد زکریا اپنے آغاز سفر سے تا حال "الطاف حسین حالی" کے کام پر مسلسل بات کرتے آئے ہیں۔

"کلیاتِ حفیظ جالندھری" میں بھی ۵۲ صفحات پر مشتمل "مقدمہ" شامل ہے۔ انداز اس مقدمہ میں بھی پہلے والا ہی ہے۔ حفیظ جالندھری کی حیات کی اہم تفصیلات سے شروع کر کے حفیظ کے تخلیقی کام خاص طور پر ان کی شاعری پر بات کرتے ہیں وہ حفیظ کا مقام متعین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"حفیظ کی نثر ان کی شاعری کی وجہ سے زندہ ہے جبکہ شاعری اپنے بل پر زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ حفیظ نے غزل، نظم اور گیت کی اصناف میں زیادہ شاعری کی ہے۔ علاوہ ازیں کامیاب ترانے اور پر تاثیر شخصی مرثیے لکھے ہیں۔ شاہنامہ اسلام ایک طویل "ایپک" ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ بچوں کے لیے انھوں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں جنھیں بچے دلچسپی سے پڑھیں کیوں کہ ان کی نفسیات کو مدِنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔" (۱۴)

حالیؔ اور حفیظؔ کے ساتھ ساتھ خواجہ محمد زکریا نے داغ کی کلیات بھی مرتب کی ہے اور محمود نظامی "نظر نامہ" بھی مرتب کیا ہے اور ان پر بھی اسی انداز کے مقدمے تحریر کیے ہیں۔ خاص طور پر محمود نظامی کے بارے میں انھوں نے بہت نایاب معلومات جمع کر دی ہیں۔

تاثراتی مضامین

خواجہ محمد زکریا ایک ادبی عالم ہے۔ فارسی اور اردو ادب پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ قدیم شاعری اور شاعروں پر ان کی خصوصی نظر ہے۔ ان کا شعری ذوق اعلیٰ پائے کا ہے۔ ان کا حافظہ لاجواب ہے۔ شعر فہمی اور خاص طور پر جدید نظم کا فہم بہت اچھا ہے اردو نثر کو بھی بہت اچھے انداز میں پڑھ رکھا ہے۔ اس لیے جب وہ کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں اپنے تاثرات بھی قلمبند کرتے ہیں تو یہ ایک باذوق اور باعلم قاری کے ہوتے ہیں۔

اردو تنقید میں تاثراتی تنقید کی اپنی تاریخ اور اہمیت ہے۔ میرے خیال میں تاثراتی تنقید کے حوالے سے سب سے اہم نام فراق گورکھپوری ہے اور ان کی تاثراتی تنقید اردو غزل کی تفہیم میں ہماری بڑی رہنمائی کرتی ہے۔ فراق گورکھپوری کے ساتھ ساتھ دوسرے تاثراتی نقاد بھی ہیں لیکن ہم اختصار کے پیش نظر خواجہ محمد زکریا کے تاثراتی مضامین کی جانب آتے ہیں۔ ہم اوپر خواجہ محمد زکریا کے تحقیقی کام اور تنقیدی کام پر بات کر آئے ہیں۔ یہاں ہم ان کے ایسے مضامین پر بات کریں گے جو تاثراتی مضامین کی ذیل میں آتے ہیں اور انھیں ڈاکٹر آصف علی چٹھہ نے "تاثراتی اور تنقیدی تحریریں" کے نام سے

مرتب کیا ہے۔

"تاثراتی اور تنقیدی تحریریں" میں تین ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں پہلا عنوان "شخصیت اور فن" ہے جس میں مختلف ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں شخصی خاکے اور تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ شخصی خاکوں پر تو ہم نے اوپر بات کی ہے۔ اس حصے میں چند تاثراتی مضامین ہیں جبکہ کتاب میں دوسرا ذیلی عنوان "تعارف و تاثر" ہے اس میں کل آٹھ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اب ہم تاثراتی تنقید کی ذیل میں ان چودہ مضامین پر بات کریں گے۔

کتاب کے مرتب! آخر آصف علی چٹھہ نے "کتاب اور صاحب کتاب" کے عنوان سے جو پیش لفظ لکھا ہے اس میں انھوں نے خواجہ محمد زکریا کے حوالے سے دیگر باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید نگاری اور تنقیدی طریقہ کار پر بھی اچھی بات کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"علوم اخذ و اکتساب ہی کے باعث ترقی کی منازل طے کرتے ہیں لیکن کسی خاص نظریے کی طرف ضرورت سے زیادہ جھکاؤ سے سمت اور عدم توازن کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ خواجہ محمد زکریا کا خاصہ یہ ہے کہ وہ جدید و قدیم تحریکوں، علوم اور تھیوریوں سے حد درجہ آگاہی کے باوجود کسی خاص نظریے سے مرعوب نہیں ہوتے اسی لیے ان کی تحریریں ایک انضباط، تحقیق اور توازن کی آئینہ دار ہیں۔ وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے جابجا مغربی دانش وروں کے اقتباسات بھی درج نہیں کرتے لیکن ان کی وسعت مطالعہ اور ژرف نگاہی نے ان کی تنقید میں گہرائی اور گیرائی کی خصوصیات کو نمایاں کر دیا ہے۔" (۱۳)

"تاثراتی اور تنقیدی تحریریں" میں شامل پہلا مضمون "پروفیسر حمید احمد خاں..... معتبر غالب شناس" میں خواجہ محمد زکریا غالب کے ناقدین میں پروفیسر حمید احمد خاں کو بہت بلند مقام دیتے ہیں اور "نسخہ حمیدیہ" کی اشاعت کو ان کا اہم کارنامہ سمجھتے ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے غالب پر لکھے گئے تنقیدی مضامین کی افادیت اور اہمیت اجاگر کرنے کے لیے وہ تنقید غالب میں ان مضامین کی انفرادیت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں کہ:

"دیگر مضامین میں غالب کی شخصیت پر قدرے مختصر مضامین، غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک، غالب کی بیوی پر مضمون بعنوان امراؤ بیگم اس بات کی عمدہ مثال فراہم کرتے ہیں کہ پروفیسر صاحب غالب کی شخصی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے کتنی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کے مضامین میں تحقیق اور تنقید اس طرح یکجا ہو گئی ہیں کہ ان میں کوئی حد فاصل قائم کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ پروفیسر

صاحب بلاشبہ ایک عالم آدمی تھے۔ اس لیے انھوں نے تحقیقی سواد کو تاریخ، معاشرت، نفسیات اور جدید تنقید مغرب سے تیار کی ہوئی باطن کی بھٹی میں اس طرح تپایا کہ وہ کندن بن کر نکلی ہے۔" (۱۴)

مشفق خواجہ اُردو تحقیق کا بہت اہم نام ہے۔ انھوں نے مزاح نگاری میں بھی اپنا اسلوب پیدا کیا۔ خواجہ محمد زکریا کے مشفق خواجہ سے دوستانہ مراسم تھے جس کا احوال انھوں نے اپنے ایک خاکے میں بیان کیا ہے۔ ان کا مضمون "مشفق خواجہ۔۔۔ بے مثال محقق" میں مشفق خواجہ کے تحقیقی کام پر بڑے سلیقے سے بات کی ہے۔ مشفق خواجہ کے اہم تحقیقی کاموں میں "جائزہ مخطوطات اُردو' 1979ء" "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" اور "کلیاتِ یگانہ" ہیں۔ کلیاتِ یگانہ کی تحقیقی قدر و قیمت کے بارے میں خواجہ محمد زکریا نے نہایت متاثر کن انداز میں تعریف کی ہے۔

"مشفق خواجہ نے "کلیاتِ یگانہ" کم و بیش پچیس تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد تیار کی۔ اس میں یگانہ کا تمام کلام جمع کیا گیا ہے۔ خواہ وہ مجموعوں کی شکل میں چھپ چکا تھا یا پھر، غیر مطبوعہ شکل میں عزیز و اقارب کے پاس موجود تھا، یا رسائل میں بکھرا ہوا تھا۔ اس مجموعے کے مقدمے، دیباچے، ضمیمے، حواشی اور تعلیقات انتہائی معلومات افزا اور قابل قدر ہیں۔ کلیات میں متن کی اغلاط نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ کلیات تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک بے نظیر نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔" (۱۵)

ہم یہ جانتے ہیں کہ خواجہ محمد زکریا تحقیق کے فن کی باریکیوں سے کس قدر واقف ہیں۔ تدوین کلیات کر چکے ہیں۔ شعری متن کو مرتب کرنے کے لیے کن کن باتوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ اس بات کی بھی آگاہی رکھتے ہیں اور جن الفاظ میں انھوں نے مشفق خواجہ کے تدوینی کام "کلیاتِ یگانہ" کی تعریف کی ہے۔ اس سے تحقیق کے فن سے ان کی گہری شناسائی صاف عیاں ہے۔ یہاں ہمیں خواجہ زکریا کی علمی دیانت اور وسیع القلبی کا احساس بھی ہوتا ہے جس سے کام لیتے ہوئے وہ اپنے ہم عصر کے کارنامے کی تعریف کر رہے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا نے اُردو فکشن کو کم کم اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند مضامین ہمیں ان کے فکشن کے ذوق اور پرکھ کے سلیقے سے آگاہی بخشتے ہیں۔ "اشفاق احمد کا ناول کھیل تماشا" ان کی عمدہ تنقیدی بصیرت کا غماز ہے۔ اپنے اس مضمون میں انھوں نے "کھیل تماشا" کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اس میں انھوں نے ناول کے پلاٹ، کردار نگاری، تکنیک اور زبان و بیان کے حوالے سے بات کر کے ناول کا اچھا فنی اور فکری جائزہ لیا ہے۔

شیر افضل جعفری سے خواجہ محمد زکریا کے قیام جھنگ سے مراسم تھے۔ شیر افضل جعفری کا شمار ان کے مخصوص شعری لب و لہجہ کی وجہ سے بہت اہم شاعروں میں ہوتا تھا" شیر افضل جعفری..... جھنگ کا قلندر" میں ابتداء تو جھنگ میں خواجہ محمد زکریا کے گزرے لڑکپن کے ایام سے ہوتی ہے۔ جب وہ بطور شاعر اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کر رہے تھے اور شیر افضل جعفری ان شاعروں میں تھے جن کی شفقت اور رہنمائی نے خواجہ محمد زکریا کی ابتدائی منازل آسان کیں۔ جھنگ کی علمی ادبی فضا اور دیار کے مشاعروں کا ذکر کرنے کے بعد وہ رفتہ رفتہ شیر افضل جعفری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور ان کی شاعرانہ انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ اپنے مضمون کے آخر پر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں کہ:

"شیر افضل جعفری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پاکستان قائم ہوتے ہی انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مستقبل میں اُردو کے دو روپ اور دو لہجے بننے والے ہیں۔ ایک لہجہ ہندوستانی اُردو کا ہوگا اور دوسرا روپ پاکستانی اُردو کا۔ وہ پہلے شخص تھے جس کی بصیرت پر یہ نکتہ روشن ہو گیا تھا کہ پاکستانی اُردو میں لازماً مقامی زبانوں کے بہت سے لفظ رائج ہو جائیں گے۔ چناں چہ انھوں نے بہت سے مقامی الفاظ کو اپنی شاعری میں بے تکلفی سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔"(۱۶)

خواجہ محمد زکریا نے حفیظ تائب کے فن پر دو مضامین تحریر کیے ہیں۔ ایک مضمون ان کی نعت نگاری پر جبکہ دوسرا ان کی غزل گوئی پر ہے۔ خواجہ صاحب اپنے مضمون "حفیظ تائب..... عظیم نعت نگار" میں فن نعت نگاری کے پس منظر میں حفیظ تائب کی نعتوں کا بڑا مبسوط جائزہ لیتے ہیں۔ حفیظ تائب کی نعت میں ہیئت کے تنوع کا وہ خصوصی حوالے دیتے ہیں کیوں کہ عام نعت گو عموماً اس طرح کی باتوں سے اجتناب کرتے ہوئے لفظ مدح رسول مقبولؐ پر ہی دھیان دیتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا رقمطراز ہیں:

"ان کی نعتوں میں ہیئتوں کا تنوع بڑا دلکش ہے۔ لفظی مناسبتیں بڑی عرق ریزی اور محنت سے یکجا کی گئی ہیں۔ یہ تلازمات لفظی لکھنوی شعرا کے برعکس سطح پر نمایاں نہیں بلکہ اشعار پر توجہ مرکوز کرنے سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ نعتوں کی زمینیں عموماً خود تراشیدہ ہیں۔ انھیں اس بات کا بڑا سلیقہ ہے کہ مصرعوں کو صوتی لحاظ سے خوشگوار کیسے بنایا جائے۔ وہ عموماً ردیف اور قافیے کو داخلی ترنم کے ذریعے خوبصورت اصوات میں سرگم بنا دیتے ہیں۔ الفاظ کی دو حیثیتیں ہیں۔ وہ معانی کے حامل ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان ایک صوتی حیثیت بھی ہے۔ حفیظ تائب کے ہاں الفاظ کے مفاہیم و اصوات کے اسرار و رموز سے گہری آگاہی دکھائی دیتی ہے۔"(۱۷)

خواجہ محمد زکریا کے مندرجہ بالا اقتباس میں حفیظ تائب کی نعت کے فنی کمالات کو جس طرح بیان کیا گیا وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس اقتباس کے مطالعہ کے بعد جب قاری ایک بار پھر حفیظ تائب کی نعتوں کو پڑھتا ہے تو اس کی خوشی دو چند ہو جاتی ہے اور وہ اس بات کو دل سے قائل ہو جاتا ہے کہ خواجہ محمد زکریا نے حفیظ تائب کو بالکل درست ایک عظیم نعت نگار قرار دیا ہے اور ہمارے عہد کو حفیظ تائب پر فخر کرنا چاہیے۔

خواجہ محمد زکریا جب حفیظ تائب کے غزلیہ مجموعے "تسبیب" پر بات کرتے ہیں تو وہ حفیظ تائب کی غزلوں کا جائزہ فن غزل گوئی کے پس منظر میں لیتے ہیں اور اردو کی کلاسیکی غزل کی شعریات کو مد نظر رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ مجموعہ غزلیات بے مثال سادگی کا حامل ہے۔ ابہام سے معریٰ، شفاف اسلوب، الفاظ اور تراکیب کی عمدہ تراش خراش، مصرعوں کی پختگی اور برجستگی، ردکا تھا جذبہ ہے اور اس سے ہم آہنگ دھیمی صوت والے الفاظ اور تراکیب کا استعمال، اس مجموعے کو دور حاضر کے غزلیہ مجموعوں میں ایک نمایاں مقام اس لیے ملنا چاہیے کیوں کہ بلند آہنگ، پرشور اور کھڑی زبان کے حامل مجموعوں میں ایک ایسے مجموعے کا اضافہ ہوا ہے جس میں شائستگی، اعتدال اور دھیما پن موجود ہے۔" (۱۸)

ہم خواجہ محمد زکریا کے اس تنقیدی طریقہ کار کی جانب اوپر بھی بات کر چکے ہیں کہ وہ جس تخلیق کار پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی فنی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہیں اور اس کام کے لیے وہ مذکورہ تخلیق کار کی خوبیوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا موازنہ معاصرین سے بھی کرتے جاتے ہیں کیوں کہ یہی انفرادیت واضح کرنے کا صائب طریقہ ہے۔

"تاثراتی اور تنقیدی تحریریں" کے دوسرے عنوان "تعارف اور تاثر" کے تحت "مرزا ہادی رسوا کی شاعری" "وحید الہ آبادی ..... ایک تعارف" "شاد عارفی ..... ایک تعارف" "حفیظ جالندھری کی غزلیات" "ڈاکٹر وزیر آغا کے ذہنی افق" اور "ریاض احمد ..... ایک جدید شاعر" بھی تاثراتی تنقید کی مثالیں ہیں اور ان مضامین میں بھی خواجہ محمد زکریا نے وہی طریقہ کار اختیار کیا ہے جس کی وضاحت ہم اوپر کر آئے ہیں۔

انتخابات

خواجہ محمد زکریا تمام عمر اُردو زبان و ادب کی تدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ طلباء کو جو متن پڑھایا جاتا ہے وہ ظاہر ہے منتخب کردہ ہوتا ہے۔ شاعروں اور تخلیق کاروں کا متن استاد ہی منتخب کرتے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا بھی اپنی تدریسی زندگی کی ابتداء سے ہی مختلف شاعروں کے متن منتخب کرتے رہے ہیں۔ اس طرح کے انتخاب کرنا بظاہر بہت آسان کام دکھائی دیتا ہے مگر اس میں کچھ مشکل مقامات آتے ہیں اور اچھا انتخاب کرنے والے فرد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ صاحب علم اور باذوق ہو۔ اس میں حسن تناسب موجود ہو۔ اس کی شخصیت میں توازن اور قوت فیصلہ اچھی ہو ورنہ انتخاب چوں چوں کا مربہ بن جاتا ہے۔

خواجہ محمد زکریا نے اپنی زندگی کا پہلا انتخاب "قدیم نظمیں" کے عنوان سے 1964ء میں ایم۔ اے کے طلباء کے لیے کیا تھا مگر اب یہ دستیاب نہیں ہے۔ دوسرا انتخاب انھوں نے 1967ء میں "اُردو کی قدیم اصناف شعر" کے عنوان سے کیا۔ یہ انتخاب بھی ایم۔ اے اُردو کے طلباء کے لیے کیا گیا تھا۔ اس میں "قصائد سودا" "قصائد غالب" "میر انیس کے مرثیے، نظیر اکبر آبادی کی نظمیں، حالی اور اکبر کی رباعیات اور اکبر الٰہ آبادی کے قطعات شامل تھے۔ قدیم شعری اصناف سے انتخاب کرتے ہوئے خواجہ محمد زکریا نے کوشش کی تھی کہ اعلیٰ ترین شعری اصناف کو منتخب کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے فن پارے منتخب کیے گئے تھے جو طلباء میں شاعری کا ذوق و شوق پیدا کریں اور ان کی تدریسی ضروریات کو اچھے انداز میں پورا کریں۔ "اُردو کی قدیم اصناف شعر" میں خواجہ محمد زکریا نے منتخب اصناف نثر، شاعروں اور فن پاروں کے بارے میں تنقیدی مضامین بھی شامل کیے تھے تاکہ طلباء کو سہولت رہے اور انھیں زیادہ تگ و دو کیے بغیر ہی سارا متن اور اس متن پر تنقید ایک ہی جلد میں دستیاب ہو جائے اور بلا شبہ یہ ایک بہت کامیاب کوشش تھی۔

خواجہ محمد زکریا نے "شعری ادب: بی۔ اے اُردو (اختیاری) کی نصابی کتاب" 1986ء میں پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کے لیے مرتب کیا۔ اپنے انتخابی معیارات کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے "ابتدائیہ" میں لکھا تھا کہ:

"بی۔ اے میں اختیاری اُردو پڑھنے والے متعدد طلبا ایم۔ اے (اُردو) میں داخل ہوتے ہیں۔ اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے پوری اُردو شاعری کا ارتقا ذہن نشین ہو جائے۔ اگرچہ تقریباً ایک سو صفحات میں اُردو شاعری کے کسی انتخاب کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ نمایاں حیثیت کے حامل شعرا کا ایک انتخاب ترتیب دیا جائے اور اس میں عام طور پر اس بات کو ملحوظ خاطر

رکھا جائے کہ اہم ترین شعرا کا انتخاب نسبتاً مفصل ہو جبکہ کم اہم شعرا کا انتخاب مقابلتاً مختصر ہو۔ (۱۹)

خواجہ محمد زکریا نے اس انتخاب کو "اسداللہ وجہی" (وفات: ۱۶۶۰ء کے قریب) سے شروع کیا تھا اور منیر نیازی (۱۹۲۳ـ۲۰۰۶ء) تک کے شعرا کی مختلف اصناف حمد، نعت، غزل، نظم، مسدس، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ سے ہوتے ہوئے آزاد نظم تک لے آئے تھے۔ انھوں نے ہر شعری متن میں موجود مشکل الفاظ کے معنی تحریر کیے تھے اور چند جملوں میں شاعر کے کوائف کتاب کے آخر میں درج کر دیے تھے۔ یوں یہ نصابی ضروریات کو پورا کرنے والا اچھا انتخاب تھا اور یہ 1986ء سے اب تک نصاب کا حصہ ہے۔

لیکن میرے خیال میں اس انتخاب کی ایک اور اہمیت بھی ہے کہ یہ انتخاب پیش خیمہ بنا انتخاب زریں..... اردو نظم (2007ء) اور پھر انتخاب زریں..... اردو غزل (2008ء) کا۔ یہ دونوں انتخاب بہت پسند کیے گئے اور جلد ہی ان کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن شائع کرنے کی نوبت آ گئی۔ خواجہ محمد زکریا نے "انتخاب زریں۔ اردو نظم" کا دیباچہ لکھتے ہوئے اردو نظم کے تاریخی ارتقاء پر بات کی تھی اور بہت اختصار کے ساتھ اردو نظم کے سفر پر روشنی ڈالی تھی۔ شاعروں کے ناموں کو بالعموم زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا اور ہر شاعر کی نمائندہ نظم یا نظموں کو اہمیت دی گئی تھی۔ نظموں کی تعداد شاعر کے مرتبے پر منحصر تھی۔ یوں مرتب نے انتخاب کا حق ادا کر دیا تھا۔

"انتخاب زریں..... اردو نظم" کی مقبولیت اور کامیابی نے خواجہ محمد زکریا کو مائل کیا کہ وہ "انتخاب زریں..... اردو غزل" بھی مرتب کریں۔ اس انتخاب میں محمد قلی قطب شاہ سے لے کر پروین شاکر تک 193 شاعر شامل تھے۔ زندہ شاعروں کو "انتخاب زریں" میں جگہ نہیں دی گئی تھی۔ "دیباچہ" میں امیر خسرو سے شروع کر کے بیسویں صدی تک کے اردو غزل کے سفر پر مختصر روشنی ڈالی گئی تھی۔ خواجہ صاحب نے ہر شاعر کے کلام سے پہلے اس کا مختصر ذکر "انتخاب زریں" نظم و غزل دونوں میں شامل کیا تھا۔

خواجہ محمد زکریا کے بارے میں، میں اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ وہ مسلسل اپنے کام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ اردو شاعری کے اس انتخاب کے ساتھ بھی ہے۔ "انتخاب زریں" دو جلدوں میں تھا بعد میں خواجہ محمد زکریا نے اسے ایک جلد "انتخاب زریں: اردو شاعری (جامع)" کی شکل دی۔ یوں اس کی ضخامت بھی کم ہو گئی کہ وہ شعرا جن کی تخلیقات نظم اور غزل ہر دو میں شامل تھیں، دونوں جگہوں پر الگ الگ ان کے ذاتی کوائف درج تھے جب اسے ایک جلد میں مرتب کیا گیا تو ظاہر ہے ذاتی کوائف صرف ایک جگہ آئے۔ شاعروں کا اندراج تاریخی

اعتبار سے کیا گیا اور قلی قطب شاہ سے لے کر پروین شاکر تک 220 شاعروں کو انتخاب میں جگہ دی گئی۔ اب بھی زندہ شاعروں کو انتخاب کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ خواجہ محمد زکریا نے "انتخاب زریں۔ اُردو شاعری (جامع)" کے دیباچے میں اپنے انتخاب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا:

"یہ انتخاب بہر حال محدود مقاصد کو پورا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ میں نے زیادہ تر مختلف درجوں کے طلبہ کی ضروریات کو مدِ نظر رکھا ہے لیکن ادبی ذوق رکھنے والے تمام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ اب ادب کے قارئین بہت کم ہوتے جا رہے ہیں۔ طلبہ صرف امتحانی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایک بڑی تعداد کے پاس اس قسم کے منتخب مجموعوں کو پڑھنے کا بھی وقت نہیں۔ چناں چہ میں اس انتخاب کا انتخاب تیار کر رہا ہوں جو جلد شائع ہوگا۔"(۴۰)

انتخاب زریں: اُردو شاعری (جامع) 570 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں فہرست اور مقدمہ وغیرہ شامل نہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے اپنے انتخاب کے انتخاب کو "انتخاب زریں: اُردو شاعری انتصار" کا عنوان دیا اور اس میں سو شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔ اور اس میں تین سو دس 310 صفحات میں شاعری کا انتخاب کیا گیا جو یقیناً اُردو شاعری کے سمندر کو اختصار کے کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ خود خواجہ صاحب نے اپنے "جواز" میں لکھا تھا:

"شعر و ادب سے لگاؤ رکھنے والوں کو ایک سو شعرا کا انتخاب کلام اس انتخاب زریں کے اختصار میں مل جائے گا۔ تاہم پوری کوشش کی گئی ہے کہ اختصار کے باوجود رجحان ساز، اہم اور کم اہم شعرا کے درمیان حد فاصل برقرار رہے اور بڑے شعرا کا کلام اتنا کم نہ ہو کہ ان کے بنیادی رجحانات کا پتہ ہی نہ چل سکے۔"(۴۱)

ہر انتخاب، مرتب کے ذوق اور ترجیحات کا عکاس ہوتا ہے۔ انتخاب زریں: اُردو شاعری (جامع) میں بعض جدید شعرا نظم و غزل کی کمی محسوس ہوتی ہے اور ایک چھوٹی سی غلطی سرزد ہو گئی ہے کہ ظفر اقبال اپنی زندگی میں ہی اس انتخاب کا حصہ بن گئے ہیں۔ اسی طرح "انتخاب زریں: اُردو شاعری (انتصار)" میں بھی بعض شاعروں کا نہ ہونا کھٹکتا ہے اور اس میں بھی ظفر اقبال اور احمد مشتاق دونوں اپنی زندگی میں شامل انتخاب ہو گئے ہیں۔

خواجہ محمد زکریا نے زیادہ تر تو شاعری کے انتخاب مرتب کیے ہیں لیکن انھوں نے اُردو کے پہلے بڑے افسانہ نگار پریم چند کے افسانوں کا انتخاب "پریم چند کے بہترین افسانے" کے نام سے کیا ہے۔ اس میں انھوں نے پریم چند کے تیرہ افسانے مرتب کیے ہیں۔ افسانے درج ذیل ہیں۔

1- راہِ نجات 2- قزاقی 3- عیدگاہ 4- مجبوری
5- دودھ کی قیمت 6- دو بہنیں 7- لاٹری 8- خانہ داماد
9- بڑے بھائی صاحب 10- پنچایت 11- دو بیل 12- طلوعِ محبت
13- کفن

جن لوگوں نے پریم چند کے سارے افسانے پڑھے ہیں وہ خواجہ محمد زکریا کے اس انتخاب کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خواجہ محمد زکریا اپنے ابتدائیہ میں "کچھ اس مجموعے کے بارے میں" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

"پریم چند کے بہترین افسانے کے نام سے یہ مجموعہ ان کے تمام مجموعوں کا عطر ہے۔ اس انتخاب سے پریم چند کے افسانوں کی تمام خصوصیات واضح ہو جائیں گی۔ البتہ ان کی فنی کمزوریاں ظاہر نہ ہوں گی جن سے روشناس کے لیے ان کے مجموعے تمام و کمال پڑھنے ہوں گے۔" (۲۲)

انٹرویوز

انٹرویو یا مکالمہ، دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان براہِ راست ایسا رخ کا ذریعہ ہے جسے زندگی کے بہت سے شعبوں میں مختلف مقاصد کے لیے نہایت کامیابی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ادب میں انٹرویو اور مکالمہ کسی لکھنے والے سے اس کے حالاتِ زندگی اور مختلف ادبی موضوعات پر سوال پوچھنے کا سب سے معروف و مقبول طریقہ ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ہمارے آج کے عہد کے نہایت اہم لکھنے والے ہیں اور گزشتہ چالیس پچاس برسوں میں ان سے بے شمار انٹرویو کیے گئے ہیں۔ خواجہ محمد زکریا چوں کہ کھل کر اپنی بات کہنے کے عادی ہیں اس لیے انھوں نے ان انٹرویوز میں بھی کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خواجہ محمد زکریا نے ادب کے نظری پہلوؤں پر نسبتاً کم لکھا ہے لیکن ان انٹرویوز میں ادب کے نظری پہلوؤں پر سوالوں کے جواب بہت احسن طریقے سے دیے ہیں۔ ان کے انٹرویوز کے حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ انھیں شفیق احمد اور محمد سلیم مظہر نے "ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: افکار و گفتار" کے نام سے مرتب کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی نے اسے شائع کیا ہے۔

ذیل میں اہم ادبی موضوعات کے بارے میں ان انٹرویوز میں موجود افکار کو درج کیا جا رہا ہے تاکہ ادب کی نظری پہلوؤں پر ہمیں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے خیالات سے آگاہی ہو سکے۔ طریقہ یہ اختیار کیا جا رہا ہے کہ اوپر سوال یا موضوع اور اس کے نیچے ان کے خیالات درج کیے جا رہے ہیں۔

شاعری کیا ہے؟

"شاعری کو بنیادی طور پر جذبات اور احساسات کے اظہار کا نام دیا جا سکتا ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ تجربے کو الفاظ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ شاعر کے پاس ایسے الفاظ بھی ہوتے چاہیں کہ اس تجربے کو بخوبی منتقل کر سکے۔" (۴۳)

ادب میں علامت نگاری

ہمارے ادب میں علامت کا استعمال کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ فارسی غزل کی ہزار سالہ روایت میں ہمیشہ سے علامتوں کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ حافظ کی غزل آج بھی متاثر کرتی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی معنویت علامتی پیرائے میں ہم تک پہنچتی ہے۔ اگر یہ علامتی شاعری نہ ہوتی تو اس وقت اس کے ساتھ ہماری دلچسپی محض تدریسی نوعیت کی ہوتی۔ اسی طرح اردو غزل کی تین سو سالہ روایت بھی علامتی انداز کی شاعری کا ثبوت مہیا کرتی ہے اور یہ بات ہر طرح سے درست ہے کہ گل و بلبل، بہار و خزاں اور سراب و دشت وغیرہ جیسے الفاظ علامتی مفہوم رکھتے ہیں۔ اسی طرح استعارہ بھی علامت کی ابتدائی شکل ہے جو ہمارے ادب میں شروع سے موجود ہے۔" (۴۴)

ترقی پسند تحریک

"ترقی پسند تحریک کو میں ایک اہم ادبی اور نیم سیاسی تحریک سمجھتا ہوں اور میری سوچی سمجھی رائے کے مطابق یہ تحریک بنیادی طور پر ایک اشتراکی تحریک ہے۔ اس تحریک نے اردو ادب میں بہت سی مخصوص اصطلاحیں داخل کی ہیں۔ مثلاً رجعت پسندی، طبقاتی کشمکش، مادیت اور استحصال وغیرہ یہ اصطلاحات خالص مارکسی اصطلاحات ہیں جن کے ذریعے ترقی پسندوں نے مارکسیت اور اشتراکیت کا پرچار کیا ہے......"

"اگرچہ ترقی پسند تحریک نے بہت سارا ادب پیدا کیا ہے لیکن اس میں اچھی چیزیں بہت کم ہیں۔ زیادہ تحریریں فنی طور پر کمزور ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کے نام تو بہت مشہور ہیں۔ میں ادب کو جمالیاتی اور فنی نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں اور یہ معیار بہت کم ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔" (۴۵)

ادب کی اسلامی تحریک

"اس بات میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ سارا اُردو ادب اپنی فضا، علامات اور تشبیہات وغیرہ کے اعتبار سے بہت حد تک اسلامی ہے۔ لیکن اسے اسلامی ادب قرار دینا ممکن نہیں ہے کیوں کہ اس میں بہت سے غیر اسلامی اجزا بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اگر انفرادی سطح پر دیکھا جائے تو اردو شاعری میں چند بہت اہم نام مل سکتے ہیں۔ جنھیں ہم بلاخوف تردید ملت اسلامیہ اور تحریک اسلامی کے شعرا کہہ سکتے ہیں۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الٰہ آبادی اور علامہ اقبال اہم ترین نام ہیں۔ یہ لوگ فن کے بلند معیار پر بھی پورے اترتے ہیں اور ان کے نظریات ملت کی تعمیر، تشکیل اور تحریک اسلامی کو مضبوط تر بنانے کے لیے بھی مدد معاون ہیں۔ اگر یہ تینوں شعرا اچھے فن کار نہ ہوتے تو ان کے بارے میں بھی میری رائے وہی ہوتی جو بہت سے ترقی پسند لکھنے والوں کے بارے میں ہے۔" (۲۶)

"تخلیق" تحقیق اور تنقید

"میں تحقیق کو تخلیقی عمل نہیں سمجھتا بلکہ میں تو تنقید کو بھی غیر تخلیقی عمل سمجھتا ہوں۔ اصل میں صلاحیتیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک صلاحیت، دوسری صلاحیت کو بعض اوقات سہارا دیتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز تخلیقی ہو۔ تحقیق ان معنی میں تخلیقی عمل بالکل نہیں ہے۔ بنیادی بات تحریر ہے، یہ ایک محنت کا کام ہے، تلاش و تجسس کا عمل ہے لیکن ایک چیز اسے تخلیق کی حدود میں تو نہیں لاتی لیکن اس کے لیے تخلیقی ذوق بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ایک شخص جسے کسی کا بائیو ڈیٹا ملتا ہے اور وہ اس کا صحیح تجزیہ نہ کر سکے اور اسے ادب کے بارے میں بہت سی معلومات خود حاصل نہ ہوں تو وہ جو تحقیق کرے گا اس میں بہت سے نقائص رہ جائیں گے۔ اس لحاظ سے ایک محقق کے لیے تخلیقی ذوق کا ہونا ضروری ہو سکتا ہے لیکن وہ جو چیز پیش کرتا ہے وہ تخلیق نہیں ہے۔" (۲۷)

پاپولر اور معیاری ادب

"دنیا بھر میں معیاری ادب کے مقابلے میں پاپولر ادب ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یورپ، امریکہ، جاپان، اور متعدد ترقی یافتہ ممالک میں "بیسٹ سیلر" ادب کے بارے میں لٹریچر شائع ہوتا ہے اور بہت سے اشتہارات دیے جاتے ہیں۔ اس قسم کا ادب عموماً ایسے قاری کے لیے ہوتا ہے جو ادب سے گہرا لگاؤ

نہیں رکھتا بلکہ اسے وقت گزاری کا مشغلہ سمجھتا ہے۔ اس ادب کی بھی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہے اور یہ قارئین کے ایک ایسے طبقے کو اپیل کرتا ہے جسے آپ ادب کے عمومی قسم کے قارئین کہہ سکتے ہیں مگر وہ اس کی باریکیوں سے نا واقف ہوتے ہیں اور اس کا تجزیہ بھی نہیں کر سکتے۔ یہی کیفیت پاپولر ادب کے قارئین کی ہوتی ہے۔ وہ ادب میں محض دلچسپی کے عنصر کو دوسرے تمام ادبی اور فنی تقاضوں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور دراصل فنی تقاضے ان کا مسئلہ ہی نہیں ہوتے۔ ہمارے ہاں مثلاً بہت سے تاریخی اور رومانی ناول لکھنے والے مقبول رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ رضیہ بٹ کے ناول بہت سی خواتین خانہ پڑھتی ہیں۔ نسیم حجازی کے تاریخی ناول عرصہ دراز تک بہت مقبول رہے ہیں۔ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کے قارئین کا حلقہ بہت وسیع رہا ہے لیکن ان کو معیاری ادب کہنا بہت مشکل ہے۔"(۲۸)

غزل کا مستقبل

اُردو غزل ماضی میں مقبول ترین صنف رہی ہے اور اس زمانے میں بھی سب سے زیادہ دلچسپی غزل میں لی جاتی ہے اور میرے خیال میں مستقبل میں بھی غزل ہی مقبول ترین صنف رہے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے اور ایک کمی سمائی نظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزل گو دو مصرعوں میں ایک بات کو بہت اچھے انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ غزل کے شعروں میں حوالہ بن جانے کی جتنی صلاحیت موجود ہے وہ کسی اور صنف میں نہیں۔ اہل ذوق اپنی گفتگو، خط و کتابت اور خطیب اپنی تقریروں میں غزل کے اشعار ہی پیش کرتے ہیں۔ ایرانیوں کو سب سے زیادہ حافظ کے شعر یاد ہیں۔ میر، غالب اور اقبال کے اشعار ہمارے ہاں لوگوں کو ازبر ہیں۔ اس بنیاد پر کوئی دوسری صنف اس کی حریف نہیں ہو سکتی۔ اس لیے جب تک اُردو زبان زندہ ہے غزل زندہ رہے گی۔"(۲۹)

ادب اور اخلاقیات

سب سے پہلے مسئلہ یہ ہے کہ خود اخلاقیات کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ یہ بہت پیچیدہ ہے۔ ایک چیز جو میرے لیے اخلاقیات کے دائرے میں آتی ہے کسی کے لیے ہو سکتا ہے نہ آتی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں مثال کے طور پر جنس، اب بڑا کھلم کھلا اظہار ہونے لگ گیا ہے اس کا۔ ایک زمانے میں منٹو کے جن افسانوں پر مقدمہ چلا تھا وہ آج بچوں کا کھیل لگتے ہیں تاہم میرا خیال یہ ہے

کہ جنس پرستی نہیں ہونی چاہیے۔ جو بات اشارے سے کی جا سکتی ہے وہ زیادہ موثر ہوتی ہے اور جو کھل کر کی جاتی ہے وہ اتنی موثر نہیں ہوتی۔ اخلاقیات میں انسان دوستی بھی اہم ہے۔ مجھ سے اگر آپ اس کی تعریف پوچھیں تو میں یہ کہوں گا کہ میں وہ حرکت نہ کروں کہ اگر وہ میرے ساتھ کی جائے تو مجھے پسند نہ آئے۔ یہ ایک Base ہے تمام تر اخلاقیات کی، اس لیے ادب کو کم از کم ایسی اخلاقیات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ باقی یہ کہ ادب کو بنیادی طور پر ادب ہونا چاہیے اس میں اخلاقیات ہو یا کوئی اور موضوع ہو تو وہ اگر ادب بن جائے تو سبحان اللہ، بہت اچھی چیز ہے۔"(۳۰)

نقاد کا کام

"تنقید بہت عجیب چیز ہے۔ میرے خیال میں تنقید میں اہم ترین چیز مطالعہ ہے۔ نقاد کا کام یہ نہیں کہ وہ فلسفیانہ تھیوریز پیش کر کے اپنا رعب ڈالے۔ اس کا بنیادی کام تفہیم اور درجہ بندی کے بعد لوگوں کو آسان پیرائے میں سمجھانا اور پیچیدگیوں کو سلجھانا ہے لیکن ہمارے یہاں عام طور پر عمل نہیں کیا جاتا۔ دوسرا تنقید میں تنقید نگار کی بہر حال پسند ناپسند ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیشہ یہ گنجائش ہوتی ہے کہ آپ نقاد کے نقطۂ نظر سے اختلاف کریں۔ گروہ بندیاں بھی تنقید کے معیار میں حائل ہیں۔ اگر معاشرے میں مجموعی طور پر دیانت کی کمی ہو تو تنقید پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ ادبی گروہ بندیاں صرف پاکستان ہی میں نہیں دوسرے ملکوں میں بھی ہوتی ہیں۔"(۳۱)

ادبی نقاد کا کام ادب کو سمجھنا اور اس کی تفہیم کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اچھے، برے اور اوسط ادب کی درجہ بندی کرتا ہے۔ جن لوگوں نے تنقید کو فلسفہ بنا دیا ہے اور نظریاتی تنقید کے پیچھے پڑ گئے ہیں انھوں نے قاری سے ادب کو چھین لیا ہے حالانکہ نقاد کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ قاری کو ادب کے قریب لائے۔ یہ فلسفے جن میں سب سے زیادہ ساختیات اور پس ساختیات جیسے نظریے ہیں ان سے ادب ایک طرف رہ جاتا ہے اور پڑھنے والا اس سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ ساختیات دراصل حقیقت کا ایک ایسا نظریہ ہے جس میں سائیکالوجی، فلاسفی، انتھروپالوجی اور مابعد الطبیعات مل جل گئی ہیں۔ خود وہ نقاد جو ساختیات پر لکھ رہے ہیں ان کا یہ خیال ہے کہ اس طریق تنقید کے نمائندوں کی تحریریں اتنی مبہم ہیں کہ بعض جگہ ان کو سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کچھ عرصے سے اس کا بہت چرچا ہے لیکن میں دیانت داری سے یہ سمجھتا ہوں کہ ساختیات اور پس ساختیات نے ہمارے طلبا اور عام قاری کو ادب سے زیادہ دور کر دیا ہے۔"(۳۲)

تنقید کا منصب

اس کا میرے نزدیک مقصد یہ ہے کہ ہر قاری کو ادب تک براہِ راست پہنچنا چاہیے مگر اس کو اتنی سہولت نہیں۔ بڑے ادب کی تہیں اور جہتیں ہوتی ہیں۔ یہ تہیں اور جہتیں ہی اس کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھتی ہیں۔ لیکن ہم ہر آدمی سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ بڑے ادب کی تفہیم کرے۔ یہ اچھے نقاد کا کام ہے کہ وہ اس پر محنت کرے لوگوں کو اس کے قریب لائے اور ان میں بڑے ادب کا ذوق پیدا کرے۔" (۳۳)

ادب، مذہب اور سیاست

ادب، مذہب اور سیاست پر اثر انداز ہوتا ہے اور مذہب و سیاست ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ دو طرفہ عمل ہے۔ یہ کہنا کہ ایک چیز صحیح اور دوسری غلط ہے تو یہ درست نہیں۔ میرے نزدیک دونوں ہی اثر رکھتے ہیں جیسا کہ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے معاشرہ اور ادب پر بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ دو طرفہ عمل ہے۔ معاشرہ لکھنے والے پر اثر رکھتا ہے تو لکھنے والا اس کی بہت سی چیزوں کی اپنے ادب میں عکاسی کرتا ہے اور پھر جو کچھ وہ لکھتا ہے تو اس کے اثرات لوگوں پر ہوتے ہیں اور وہ اثرات معاشرے میں پھیلنا شروع ہو جاتے ہیں اس لیے یہ دو طرفہ عمل ہے۔" (۳۴)

ہم نے اوپر صرف چند نمونے خواجہ محمد زکریا کے انٹرویوز سے دیے ہیں۔ خواجہ صاحب کے انٹرویوز سے اس نوعیت کے بیسیوں اقتباسات نقل کیے جا سکتے ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ ادب اور تنقید ادب کے مختلف پہلوؤں پر مسلسل سوچ و بچار کرتے رہتے ہیں اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے تو بڑی صاف گوئی سے مدلل اور سلیس انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور ایسا صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے چیزوں کا گہرا فہم حاصل کیا ہو۔

حواشی

۱۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ۔ چند اہم جدید شاعر۔ سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور 2015، ص:74

۲۔ ایضاً، ص:124

۳۔ آصف علی چٹھہ، ڈاکٹر۔ مرتبہ: تاثراتی اور تنقیدی تحریریں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ سنگِ میل پبلشرز، لاہور۔ 2017، ص 8-9

۴۔ ایضاً، ص:40

۵۔ ایضاً، ص:64

۶۔ ایضاً، ص:113

۷۔ ایضاً، ص:119

۸۔ ایضاً، ص:143

۹۔ ایضاً، ص:143

۱۰۔ وحید قریشی، ڈاکٹر (مرتب) مطالعۂ شعر و شاعری: کلاسیکی ادب الحمد پبلی کیشنز، لاہور 2018، ص:14

۱۱۔ ایضاً، ص:۴۳

۱۲۔ محمد زکریا، خواجہ (ترتیب و تدوین) کلیاتِ حفیظ جالندھری، الحمد پبلی کیشنز، لاہور 2018، ص:۳۳

۱۳۔ آصف علی چٹھہ، ڈاکٹر (مرتب) تاثراتی اور تنقیدی تحریریں: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا۔ سنگِ میل پبلشرز، لاہور۔ 2017، ص:9

۱۴۔ ایضاً، ص:23-24

۱۵۔ ایضاً، ص:71

۱۶۔ ایضاً، ص:102

۱۷۔ ایضاً، ص:127

۱۸۔ ایضاً، ص:134

۱۹۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ۔ (مرتب) شعر و ادب: بی۔ اے اردو (اختیاری) کی نصابی کتاب۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور 1980۔ ص:5

۲۰۔ محمد زکریا، خواجہ۔ (مرتب)۔ انتخابِ زریں: اردو شاعری (جامع)۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی۔ لاہور۔ 2019، ص:۴۳

۲۱۔ محمد زکریا، خواجہ۔ انتخابِ زریں: اردو شاعری (اختصار) اردو اکیڈمی پاکستان۔ لاہور۔ ۲۰۱۹، ص:۶

۲۲۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ (ترتیب، انتخاب، تنقید) "پریم چند کے بہترین افسانے" مکتبہ میری لائبریری، لاہور میں ... (۹ نومبر ۱۹۷۳) لکھا اس مجموعے کے بارے میں، ص:۲

۲۳۔ شفیق احمد، محمد سلیم مظہر۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: افکار و گفتار۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور: ۲۰۱۲ء، ص: ۱۷

۲۴۔ ایضاً، ص: ۲۵

۲۵۔ ایضاً، ص: ۳۰

۲۶۔ ایضاً، ص: ۳۱

۲۷۔ ایضاً، ص: ۳۹

۲۸۔ ایضاً، ص: ۴۳

۲۹۔ ایضاً، ص: ۲۲۵

۳۰۔ ایضاً، ص: ۲۳۹

۳۱۔ ایضاً، ص: ۲۸۳

۳۲۔ ایضاً، ص: ۲۹۲

۳۳۔ ایضاً، ص: ۲۹۸

۳۴۔ ایضاً، ص: ۳۹۳

ضمیمہ

صاحبانِ قرطاس و قلم کی آرا

خواجہ محمد زکریا اس اعتبار سے بھی ایک خوش قسمت لکھنے والے ہیں کہ ابتدا ہی سے ان کے اساتذہ و رفقا، اور معاصرین کی جانب سے ان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ ذیل میں اہلِ قرطاس و قلم کی چند آرا درج کی جا رہی ہیں:

ڈاکٹر سید عبداللہ

عزیز مکرم خواجہ محمد زکریا کے اس مجموعے مضامین (نئے پرانے خیالات) سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا..... انھوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں یا پھر ایسے ہیں جن کے بارے میں کوئی الجھن یا مغالطہ یا اختلاف رائے ہے۔

اس مجموعے کے باقی مضامین بھی چونکا دینے والے ہیں..... ان کو پڑھ کر ان کے نتائج سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن آسانی سے انھیں ٹالا نہیں جا سکتا۔ پڑھنے والا اختلاف کرنا بھی چاہے گا تو کافی محنت کرنے کے بعد۔ کافی تحقیق و کاوش کے بعد..... بہر حال میں ان مضامین سے محظوظ بھی ہوا ہوں اور مستفید بھی!

ڈاکٹر وحید قریشی

خواجہ محمد زکریا کے یہ مضامین بعض مشہور شاعروں، ناول نویسوں اور ادبی تحریکات سے متعلق ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب روشِ عام سے ہٹ کر بات کہنے کے عادی ہیں۔ انھوں نے ان موضوعات میں بھی ادبی مسائل اور شخصیتوں کے بعض نئے پہلو دریافت کیے ہیں۔ انھوں نے ادب کی بندھی ٹکی آرا اور بعض شعرا و ادبا کے بارے میں مدرسانہ انداز میں بیان کی گئی باتوں کو قبول نہیں کیا بلکہ شعرا

وارثا کے کلام اور نثر پاروں سے براہ راست اپنی رائے متعین کی ہے۔ یہ راست وقت طلب بھی ہے اور اختلافی بھی۔ خواجہ صاحب اپنے اسلوب ہی میں نہیں بلکہ ادبی تجزیے میں بھی ایک خاص طرح کا جارحانہ انداز رکھتے ہیں۔ لیکن اس تجزیاتی نقطۂ نظر میں وہ کہیں بھی بعض دوسرے نقادوں کی طرح جذباتی ہو کر رومانی انداز کی جملہ سازی پر نہیں اترتے۔ ان کی باتیں تلخ و تند ہو سکتی ہیں۔ ان سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن مجموعی اعتبار سے ان کی تنقید کی دلکشی اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یک رُخے نہیں۔ شاعری اور افسانہ دونوں میں بیک وقت تنقیدی بصیرت رکھتے ہیں بلکہ ناول کے سلسلے میں ان کے تجزیاتی مطالعے پریم چند کو ایک بالکل نئے زاویے سے دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ افسانے کی تنقید میں اب تک ہمارے قارئین جس بندھے ٹکے کلام کے عادی رہے ہیں خواجہ صاحب ان سے یکسر مختلف، زیادہ وسیع اور بہتر کلامِ تنقید پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈاکٹر خواجہ زکریا نے اُردو تنقید میں نئے نئے ابعاد تلاش کیے ہیں۔ انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو تاریخ ادب میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ بعض مسلّمہ اور پختہ فکری مغالطوں کو انھوں نے جس طرح بے نقاب کیا ہے وہ خاصا وقیع ہے اور اس سے ان کے تحقیقی اور تنقیدی رجحانات کے توازن کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

ان کی فعال ادبی زندگی میں صرف دو شعبوں کو اہمیت حاصل ہے۔ اول ادب کی درس و تدریس، دوم تنقید و تحقیق۔ بلاشبہ مجلس آرائی ان کی زندگی کی پاطنی سرگرمی ہے۔ لیکن غور کیجیے تو وہ بزم میں بھی ادب کو فوقیت دیتے ہیں۔ شاعری ان کی پہلی محبت تھی، جسے انھوں نے نامساعد حالات میں بھی زندہ رکھا اور جاپان میں کچھ عرصے کا قیام تو یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ جب "تنہائی" ان پر حملہ آور ہوئی تو شاعری نے ان کی معاونت کی اور "جاپان میں اجنبی" جیسی نظم معرضِ تخلیق میں آئی۔

ڈاکٹر انور محمد خالد

''خواجہ محمد زکریا کا ایک اور اہم کام، اُردو شاعری کا، دو الگ الگ کتابوں کی شکل میں خوبصورت انتخاب ہے، جو انتخاب زریں: اُردو نظم، اور انتخاب زریں: اُردو غزل کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان بے مثال مجموعوں میں نہ صرف اوائل سے لے کر اب تک کے اہم شعرا کا منتخب کلام جمع کیا گیا ہے بلکہ بعض شعرا کے ضرب المثل اشعار یا دوسروں سے منسوب اشعار یا مفرد مشہور مصرعوں کے مکمل اشعار بھی درج کیے گئے ہیں اور یوں تجسس، باذوق قارئین کی ایک ادبی ضرورت پوری کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔''

ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر

خواجہ صاحب کو عروض پر جو استادانہ مہارت ہے اس نے انھیں غیر معمولی قدرت بیان عطا کی ہے جس کی بنا پر وہ انتہائی مشکل قافیے سہولت اور بے ساختگی سے استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ مشکل قوافی کا استعمال عموماً کلام کو بے ساختگی اور فطری بہاؤ سے محروم کر دیتا ہے مگر انھوں نے گنڈے، ٹھنڈے، منڈے، پھندے کے قافیے اس سہولت اور بے ساختگی سے نبھائے ہیں کہ آورد اور دقت استعمال کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

کتابیات

بنیادی ماخذات: از پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

۱۔ قدیم نظمیں، سنگِ میل، لاہور ۱۹۶۲ء

۲۔ قدیم اصنافِ شعر، لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۸ء

۳۔ نئے پرانے خیالات، لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۸ء

۴۔ پریم چند کے بہترین افسانے (انتخاب مع مقدمہ)، میری لائبریری، لاہور ۱۹۷۷ء

۵۔ اردو میں طنز نگاری، عجیب بک ڈپو، لاہور ۱۹۷۷ء

۶۔ اقبال کا ادبی مقام، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۷۷ء

۷۔ اکبر الٰہ آبادی، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۸۰ء

۸۔ ان گنت سورج (انتخاب کلام مجید امجد)، یونیورسل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۰ء

۹۔ انتخاب مقالات اقبال (بین الاقوامی صد سالہ اقبال کانگرس کے مقالات کا انتخاب)، باشتراک پروفیسر محمد منور، پنجاب یونیورسٹی، شعبہ اقبالیات، لاہور ۱۹۸۲ء

۱۰۔ کلیاتِ مجید امجد (آٹھواں ایڈیشن)، الحمد پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۳ء

۱۱۔ شعری ادب (بی اے اردو کی نصابی کتاب)، پاپولر پبلشرز، لاہور ۱۹۸۶ء

۱۲۔ شرح بانگِ درا (باشتراک ڈاکٹر شفیق احمد)، پاپولر پبلشرز، لاہور ۱۹۹۱ء

۱۳۔ Urdu For Beginners، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۱ء

۱۴۔ روشنی کی جستجو، علامہ عبدالحکیم کا غیر مطبوعہ کلام، عمیر پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۲ء

۱۵۔ انتخاب قتیل شفائی (باشتراک احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد)، الحمد پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۳ء

۱۶۔ اقبالیات: چند نئی جہات، انجمن علم و ادب، لاہور ۲۰۰۱ء

۱۷۔ تفہیم بالِ جبریل، بزمِ اقبال، لاہور ۲۰۰۲ء

۱۸۔ چند اہم جدید شاعر، سنگت پبلشرز، لاہور ۲۰۰۳ء

۱۹۔ کلیاتِ حفیظ جالندھری (مقدمہ، ترتیب، تحقیق)، الحمد پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۵ء

امجد طفیل، افسانہ نگار، تنقید نگار، مترجم، مرتب اور ماہر نفسیات ہیں۔ انھوں نے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اور بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدر شعبہ نفسیات گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے اینٹیک شاپ (1990ء) اور مچھلیاں شکار کرتی ہیں (2007ء) شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں مجموعے "میرے افسانے" میں یکجا کیے گئے ہیں۔ دیگر کتابوں میں "قرۃ العین حیدر، تشخص کی تلاش میں" (1991ء)، "منیر نیازی فن و شخصیت" (2016ء)، اور "ادب کا عالمی دریچہ" (2012ء) شامل ہیں۔

انھوں نے "سعادت حسن منٹو کی تحریریں" کو سات ضخیم جلدوں میں مرتب کیا۔ کلیات ڈاکٹر محمد اجمل، قرۃ العین حیدر کے شہکار ناولٹ، عزیز احمد کے شہکار ناولٹ، منشا یاد کے بے مثال افسانے، رشید امجد کے بے مثال افسانے، ممتاز مفتی کے ممتاز افسانے، ڈاکٹر اظہر علی رضوی کے مقالات، پاکستانی ادب (نثر 2006ء) بہ اشتراک شیخ محمد سعید کے علاوہ ابن انشا پر لکھی اے حمید کی کتاب کی تدوین، رشید امجد کی "میرا جی: شخصیت اور فن" اور "مستنصر حسین تارڑ: شخصیت اور فن" پر نظر ثانی کی ہے۔ نفسیات میں "ژاں پیاژے کے نظریات" بہ اشتراک اسرار احمد، مشاورتی نفسیات بہ اشتراک فہمیدہ بانو، نفسیات اور جدید زندگی، پرسکون زندگی، مسلم نفسیات کے خدوخال (شریک مصنف) بھی ہیں۔ نفسیات کی ایک کتاب کا ترجمہ "مردانہ تشدد کا خاتمہ" کے عنوان سے صہیب یاسر کے ساتھ مکمل کر لیا ہے۔ لاہور سے ایک رسالہ "استعارہ" شائع کر رہے ہیں۔